اپریل سنہ ۱۹۰۱ء جلد (۱) عدد (۱)

ایڈیٹر

شیخ عبد القادر - بی - اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین نظم

کوہستان ہمالہ - شیخ محمد اقبال صاحب ایم - اے قائم مقام پروفیسر انگریزی گورنمنٹ کالج لاہور - ۳۳
تدبی کا راگ - محمد ظفر علی خاں صاحب بی - اے مترجم دفتر ہوم سکرٹری سرکار دکن ... ۳۶
نیرنگ شفق - میر غلام بھیک صاحب نیرنگ بی - اے وکیل انبالہ ۳۸
دل و دماغ - حافظ سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آباد (پٹنہ) ... ۳۹
حسن طلب - چودہری خوشی محمد صاحب بی - اے ناظر رود اسسٹنٹ ریاست جموں و کشمیر - ۴۰
منتخبات میر - ۴۲ - چٹکلے ... ۴۵

مضامین نثر

بناوٹ اور سادگی - ایڈیٹر - ۱
مطالعہ الفاظ - مولوی احمد دین صاحب - بی - اے - وکیل لاہور ... ۸
دہلی غدر سے پہلے - لالہ سری رام صاحب - ایم - اے - دہلوی ۱۵
فن تقریر - ایڈیٹر - ۲۵
خاتونوں کا ورق ،، - ۳۰

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں *

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے - □ ان شہروں میں اردو مروج ہے - ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے *

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبد القادر بی - اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن کی چند خصوصیتیں

اوّل۔ انگریزی مضمون نگاری کی دلچسپیاں اپنی زبان میں پیدا کرنا مگر ایسی نزاکت سے کہ پرانے مذاق کو ناگوار نہو۔ اور حتی الوسع اردو انشا پردازی کے ضروری اصولوں میں سے کسی سے انحراف نہ ہو۔ انگریزی الفاظ اور محاورات اور بندشوں کے اندھا دھند اردو میں داخل کرنے کا ناپسندیدہ مذاق جو بڑھتا جاتا ہے اُسکو روکنے کی کوشش کیجائیگی۔ اور اسبات کی احتیاط ہوگی کہ ممکن ہو تو انگریزی لفظ کی بجائے اُسکا ترجمہ لے لیں۔ بشرطیکہ پورا مفہوم ادا ہو جائے۔ چنانچہ اس رسالہ کا نام انگریزی لفظ میگزین کا صحیح ترجمہ ہے۔ اور گو میگزین بھی اردو میں سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب میگزین اصل میں عربی لفظ مخزن سے مشتق ہے۔ تو کیوں ہم مخزن کو ان معنوں میں استعمال نکریں۔ جب لفظ مخزن زبان اردو میں زیادہ خوبصورتی سے کھپتا ہے۔

دوم۔ اسکے مضامین بالعموم ایسے ہونگے جو کسی ایک مذہب و ملت کے مذاق تک محدود نہ ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونو کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا جائیگا۔ اور ہر طرح اسبات کی سعی کیجائیگی کہ ہر مذہب کے ناظرین اس رسالہ کے مطالعہ سے حظ اٹھائیں۔ ہمارے ہندو ہموطنوں میں بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب اردو مضامین کے ایسے ہی مشتاق ہیں جیسے مسلمان۔ اور اردو لکھنے کا بھی بہت سے صاحبان شوق رکھتے ہیں۔ اور یہ رسالہ ایسا جامع بنانا چاہتا ہے کہ ہندو مسلمان مضمون نگار یکساں شوق سے اسمیں مضامین لکھیں اور ہر قوم کے شائقین پڑھکر یکساں لطف اٹھائیں

سوم۔ فن تقریر و فصاحت کو جو اس زمانہ میں مغرب میں بحیثیت فن کے سیکھا اور سکھایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں رواج دینا تاکہ ہندوستان کے ایسے مقررین جنکو قدرت نے قوت بیانیہ اور جوش اور اثر عطا کیا ہے۔ فصاحت کی نئی معلومات سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور اس مطلب کے حصول کی تسہیل کیلئے کبھی کبھی بعض نامور فصحائے فرنگ کی تقریروں کے ترجمے بامحاورہ اردو میں دئے جائینگے تاکہ یہاں کے طلبائے فصاحت کے لئے نمونہ کا کام دیں۔

چہارم۔ انگریزی نظموں کے نمونے پر طبعزاد نظمیں۔ انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے۔ خیالاتی نظمیں اور پرانے رنگ کی نظم کا انتخاب اسمیں جمع کئے جائینگے۔ تاکہ متقدمین کی تقلید کرنیوالے جدید مذاق سے آگاہ ہوں۔ اور انگریزی خوان اپنے ملک کے پرانے ذخیروں سے مطلع ہوں۔

مخزن

بناوٹ اور سادگی

بناوٹ بھی اک فن ہی جو جانتا ہو
تری سادگی کچھ ہمین جانتے ہین

مندرجہ عنوان شعر کی خوبی یوں تو ظاہر ہی۔ مگر لطافت خاص اس میں یہ ہے کہ اس کا اطلاق محدود نہیں۔ سادگی سے مراد لیجیے سچ۔ اور بناوٹ کو قرار دیجیے دروغ۔ سچ سچ ہی خواہ اُسے لاکھ پردوں میں چھپائیں۔ جس رنگ مین جلوہ گر ہو۔ پہچاننے والے پہچان جائینگے۔ ایسے ظاہر بین زمانہ میں جیسا کہ ہمیں نصیب ہوا ہی۔ یہ اصول خطرناک تو ضرور ہی۔ مگر پھر سچا اصول ہی۔ گو ایکدفعہ تو سچی بات کہنے ہی اُنگلیاں اُٹھ جاتی ہیں۔ اور آجکل دروغ کو فروغ ہی۔ مگر تا بہ کے۔ گلٹ کے گہنے چند دن تو چاندی سونے کے زیوروں کو مات دیتے ہیں۔ مگر جب عارضی چمک اُڑی۔ اور نیچے پیتل اور تانبا نظر آیا۔ پھر اُن سے ذلیل اور بدنما چیز قیاس میں نہیں آسکتی۔ اور اس بدنمائی کے آثار ابھی ظاہر ہونیکو ہوتے ہیں۔ کہ وہی حسین جنہوں نے بڑے چاؤ سے ایسے زیوروں کو باعثِ زینت ٹھہرایا تھا۔ انہیں نہ صرف نظروں سے گرا دیتے ہیں۔ بلکہ اُتار کے پھینک دیتے ہیں۔ اور آخر سونا سونا ہی ہے۔ جتنا پُرانا ہوتا جائے۔ جتنا اُسے گھسو۔ جتنا اُسے پتھر پر رگڑو۔ اپنے جوہر اصلی دکھاتا ہے۔ اور کبھی کسی نازکبدن کے کانوں سے

اُترے بھی تو صراف کی صندوقچی میں قدر و منزلت سے بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ گھر میں عزت پاتا ہے تو بازار میں بھی اسکی توقیر ہے۔ اور بازار سے گراں ملتا ہے تو گھروں میں بھی منزلت ہوتی ہے۔ جو نسبت کھوٹے کو کھرے سے ہے وہی تناسب بناوٹ اور سادگی میں ہے۔ تسپر بھی ایک عالم بناوٹ پر مٹا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ بہت تھوڑی آنکھیں ہیں۔ جنکو وہ بینائی عطا ہوئی ہے۔ جو بناوٹ کے پردوں کو ہٹا کر ہر چیز کے حُسن و قبح کو اُس کی عریانی میں دیکھ سکے +

جو لوگ سادگی کے نظّاروں سے آشنا ہیں۔ وہ بناوٹ کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مگر بناوٹ کے شیدائی بھی کیا کریں۔ اس دُنیا میں رہکر دُنیا سے الگ رہنا یہ بھی تو ہر کسی کا کام نہیں۔ اور وہ اپنے اپنے طور پر ایک ادنی نمونہ اُس بڑی مثال کا دکھا رہے ہیں جو دُنیا نے اُنکے لیے قائم کی ہے۔ پرانے شعرا اور مُصنّفین کی تحقیق مُتّفق اللفظ ہو کر گواہی دے رہی ہے۔ کہ دُنیا جس کے حُسن زاہد فریب کے لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا مُبتلا ہیں۔ اصل میں ایک زالِ پیر ہے۔ جو صرف خط و خال کی آرایش سے لوگوں کے دلوں کو لبھا کر دامِ تزویر میں لا رہی ہے۔ اور اگر اُسکے چہرہ سے وہ پوڈر اور سُرخی جو اسکی زینت ہے دھو ڈالی جائے۔ اور اسکے مصنوعی کالے اور لمبے بال اُکھاڑ پھینکے جائیں۔ اور اسکے بناوٹی سفید دانتوں کی لڑی جو یہ کسی متنفس کے روبرو نہیں اُتارتی۔ نکال باہر کی جاوے۔ اور اسکی اصلی شکل کسی کو دکھا دیجاوے۔ تو پھر اسکے شیدائی اس سے قطع تعلق کر لینا تو کیا۔ کسی حسین کے حُسن پر اعتبار نہ کریں۔ اور سب سے کنارہ کش ہو کر اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ جائیں۔ پس جب یہ دُنیا بذاتِ خود ایک بڑا دامِ تزویر ہے جو اس عالم

پر پھیلا ہوا ہی۔ تو وہ لوگ جو اس بڑے دام کے نیچے چھوٹی چھوٹی جالیاں لگاتے ہیں۔ معذور ہیں۔ اور جو بیچارے نادانستہ ان چھوٹے پھندوں میں پھنستے ہیں وہ معذور تر۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ بناوٹ کا پھندا بڑا زبردست پھندا ہے جسے دیکھو اسکا شکار ہی۔ عشاق ہیں تو زلفوں کے پیچ وخم کے پھیر میں۔ شعرا ہیں تو کلام میں تلازم کی تلاش میں ہیں - واعظ ہیں تو ناز وکرشمہ برسرِ منبر کے انداز سوچ رہے ہیں۔ مضمون نگار ہیں تو انہیں قافیہ بندی کی دھن لگی ہوئی ہی۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جسکی زلف پُر پیچ کے دیوانے ہیں۔ وہ اس قابل بھی ہی کہ اُسے چاہیں۔ کوئی نہیں دیکھتا کہ جس کلام کو تلازم کے نمک مرچ سے لطیف بنا رہے ہیں وہ کسی ذاتی صفت سے بھی متّصف ہی یا نہیں۔ کوئی نہیں غور کرتا۔ کہ وعظ میں نکات بھی دلپذیر ہیں یا محض اندازہی کی نقلہ ہی۔ اور کوئی نہیں پروا کرتا کہ قافیہ بندی کی دھن میں کہیں اصل مضمون ہی خراب نہ ہو جائے +

اردو و علمِ ادب کو کج تک اس بناوٹ کے شوق نے نہایت نقصان پہنچایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو زبان ابھی ایک نوعمر زبان ہی۔ اور مقدار کے اعتبار سے اسکے ادب کا ذخیرہ کچھ تھوڑا نہیں۔ سینکڑوں دیوان اشعارِ آبدار سے پُر ہیں۔ مثنویاں ہیں۔ واسوختیں ہیں۔ مرثیے ہیں تہنیتیں ہیں۔ ہجو ہی۔ قصائدِ مدح ہیں۔ نثریں قصے ہیں۔ افسانے ہیں۔ رقعات ہیں۔ اور حال میں کتب تاریخ وسیر و فلسفہ اردو میں موجود ہو گئی ہیں۔ اخبارات ہیں۔ رسالے ہیں۔ اردو لکھنے اور بولنے والوں میں لکچرار ہیں۔ واعظ ہیں۔ لطیفہ گو ہیں۔ بذلہ سنج ہیں۔ رلانے والے ہیں۔ ہنسانے والے ہیں۔ غرض جو آثار کسی لٹریچر کی ترقی کے ہوتے ہیں سب کے سب

موجود ہیں - مگر صرف ذخیرہ کی کمیت پر نظر ڈالنے اور کیفیت کا لحاظ نہ کرنے سے صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا - کہ ذخیرہ کس پایہ کا ہے - اور کیفیت کا جو حال ہے وہ ناگفتہ بہ ہے - پہلے نظم کو ہی دیکھئے - کہ از سر تا پا بناوٹ ہے - اکثر حصوں کی نسبت تو خود مصنفین اظہار کرتے ہیں کہ ان میں فلاں صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے - نہ صرف ہماری نظم کی ظاہری صورت میں بناوٹ سے کام لیا گیا ہے - بلکہ خیالات بھی اکثر تصنع سے پُر ہیں - جن پیچیدہ جذبات دلی کے ظاہر کرنے کے لئے یہ ملکہ بعض طبیعتوں میں قدرت نے ودیعت کیا تھا - انکو ہمارے شعرا اکثر دل میں ہی چھپائے چلے گئے ہیں - اور لیلی کی صورت پر طعنے دینے اور مجنوں کے ساتھ وحشت میں مقابلہ کرنے - فرہاد کو کم ہمت ٹھہرانے - اور شیریں کی بیوفائی کی تشہیر میں اپنی ہمتیں صرف کر گئے ہیں - اس سے بڑھکر تصنع کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے - کہ اکثر شعرا کو اس عظیم الشان اور وسیع ملک ہندوستان میں کوئی دو سچے عاشق و معشوق اہل ملک میں سے ایسے تلاش کرنیکا خیال نہیں ہوا جنکی باہمی محبت کے قصوں سے وہ اپنی نظم میں کام لیں اور اس کثیر الوقوع معاملے میں بھی کتب فارسی کے دست نگر رہے ہیں - جو جو شوق اکثر شعرا نے نظم میں ظاہر کئے ہیں - اُن میں بہت سے اُن کے اصلی شوق نہیں - صرف تقلیدی طور پر اُنکے مضامین باندھتے آتے ہیں - مثال کے طور پر دیکھئے - کہ مہندی کو اس زمانہ میں وہ مقبولیت نہیں رہی جو آج سے چالیس پچاس سال پہلے تھی - اُسوقت حسن کی آرائش کے لوازم میں حنا نہایت ضروری تھی - اب شادی بیاہ - دن دہار میں تو رسماً استعمال ہوتی ہے مگر نئے فیشن میں پسندیدہ چیز نہیں رہی - نہ حسین اسے باعث زینت سمجھتے ہیں اور نہ دیکھنے والے اسکے رنگ کو کچھ بہت خوش ہو کر دیکھتے ہیں - اس پر یہ حال ہے - کہ

آجکل جو اشعار کے مجموعے چھپتے ہیں - جن میں نوجوان شعرا پرانے رنگ میں طبع آزمائیاں کرتے ہیں - اُنکو اُٹھا کر دیکھئے - شاید کوئی حنا کی تعریفوں سے خالی ہو - سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی مصنوعی شاعری سے کیا حاصل ہے - اگر یہی طبیعتیں جو تقلید کے بندوں میں جکڑی رہیں - اپنے بل پر اُڑتیں - تو دُنیا اُنکی بلند پروازیاں دیکھکر حیران ہوتی - مگر ابتدا میں ہی کچھ ایسی بُنیاد پڑی کہ بناوٹ کے سلسلہ سے رہائی نہیں ہوئی - نثر میں بھی آج سے بیس پچیس برس پہلے تک یہی رنگ ہے - عبارتیں مقفٰے - الفاظ زیادہ - خیالات کم - خطوط میں القاب لنبے اور مطالب مختصر - ضرورت سے زیادہ مبالغہ - ضرورت سے زیادہ لجاجت - رقعات کے رنگ کو تو پہلے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے پلٹا - اور اُردو نثر کی سادگی میں وُہ پُرکاری دکھائی کہ آج تک کسی سے اسکا جواب نہیں ہو سکا - اگر خدا کو یہ منظور ہوتا کہ مرزا غالب بجائے اُنیسویں صدی کی ابتدا کے اسکے وسط میں پیدا ہوتے اور اسوقت زندہ ہوتے تو نئے زمانہ کی ہوا سے اُنکی طبیعت وُہ جلوہ دکھاتی - کہ اُردو نظم مطالب اور معانی کی بلندی کے اعتبار سے ہر زبان کی عمدہ نظم سے مقابلہ کا دعوے کر سکتی - اور نثر میں وُہ جادو ہوتا جسے طبیعتیں آج کل ڈھونڈھتی ہیں اور نہیں پاتیں - تاہم جس زمانہ میں مرزا غالب ہوئے اُسکے اعتبار سے جو کچھ وُہ نثر کی تجدید میں کر گئے نہایت حیرت خیز ہے - اس کے بعد سر سید احمد خاں مرحوم نے اُردو نثر میں انگلستان کے سلیس سے سلیس لکھنے والوں کا نقشہ دکھایا - اور اُس نے سب سے پہلے یہ دکھا دیا - کہ کلام بغیر رنگینی کی کوشش کے مؤثر اور پُرزور ہو سکتا ہے - اور زبانِ اُردو باوجود اپنی نوعمری کے ایسے ایسے دقیق مطالب کے ادا کرنے کی متحمل ہے جو کبھی اور زبانیں باوجود پیرانہ سالی

کی مشق کے نہیں ادا کر سکتیں - سر سید احمد مرحوم کا یہ شوق رفتہ رفتہ اُنکے احباب تک پہنچا - اور اب بہت سے اصحاب سادہ مگر پُر مطلب مضامین لکھنے والے مُلک میں پیدا ہو گئے ہیں - نظم میں سادگی سب سے پہلے اختیار کرنے کے ثواب کے مُستحق مولانا الطاف حسین صاحب حالی ہیں - اور اب شعر میں سادگی - اصلیت اور جوش دکھانے والے شعرا ہندوستان میں موجود ہوتے جاتے ہیں - ہم آج سادگی کی اصلی دلفریبیوں کے قدردانوں کو صلائے عام دیتے ہیں کہ اگر سادگی اور بناوٹ کا جنگ دیکھنا ہو - تو ہمارے پاس آئیں - اور مخزن کے صفحوں میں دیکھیں - بناوٹ کو اپنی قدامت پر ناز ہو اور ہو سکتا ہو - اُسکو اپنے دلدادوں کی تعداد کا گھمنڈ ہو اور بجا ہو - مگر سادگی کو اپنی سچائی پر بھروسا ہو اور درست ہے اور سب سے بڑی تسلی اُسے یہ ہو کہ زمانہ کی رفتار اُسکے موافق ہو - یہ نیا مذاق مُلک میں بہت کچھ تہذیب الاخلاق کے نامور ایڈیٹر اور اُسکے ہمراہیوں اور حسن کے فاضل مضمون نگاروں کی کوششوں کا نتیجہ ہو - اور گو یہ دونو بیش بہا رسالے اب موجود نہیں - مگر اُنکے قیمتی مضامین موجود ہیں اور مُلک کے لٹریچر پر انکا اثر موجود ہو - اور یادگار رہیگا - مگر یہ ظاہر ہو کہ مُلکی لٹریچر ابھی اس قسم کی خدمات سے مستغنی نہیں - جو ان رسالوں نے کیں تھیں - اور کسی قدر ضروریات اور حالات بدل بھی گئے ہیں - اور متقاضی ہیں کہ کوئی علمی رسالہ مناسب حالات وقت نکلے - ہم میں اور اُن بزرگواروں میں جنھوں نے اس سنگلاخ زمین میں سفر مینا کا کام کیا کوئی نسبت نہیں - ہم اُنکے خوان کے زلہ رُبا ہیں - مگر چونکہ انکی سر توڑ محنتوں سے اب راستہ بھی آسان ہو گیا ہو - ہم بھی اس طریق میں رہروی کا

عزم کر سکتے ہیں۔ اور اپنی ناچیز حیثیت کے موافق زبان اُردو کی خدمت کرنے کے عشق میں اس امر کی پروا نہیں کرتے کہ راستہ میں کیا دقّتیں اور دشواریاں پیش آئینگی اور ہم کہانتک اپنے ارادوں میں کامیاب ہونگے۔ صرف یہ جانتے ہیں کہ اُردو خواں اصحاب کے لئے آسان اور تفریحی مطالعہ کا کافی سامان موجود نہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ تہذیب اور حسن کے برابر نہ سہی۔ اس سے کم۔ ہم کہانتک اس سامان کے مہیا کرنے میں مفید ہو سکتے ہیں ۔

دیر است کہ آوازۂ منصور کہن شد — تو بارِ دگر تازہ کنی دار و رسن را

اسوقت جو ماہوار رسالے مُلک میں شائع ہو رہے ہیں۔ اُن میں ہم دلگداز۔ معارف۔ افسر۔ اور اودھ ریویو کو نہایت غنیمت سمجھتے ہیں۔ اور اُنکے مفید کام میں اُن کے ساتھ شریک ہوکر اُنکا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے چند ماہوار رسالے ہرگز کافی نہیں۔ اُردو اخبارات کی تعداد کے ساتھ رسالوں کی تعداد کو کوئی نسبت ہی نہیں اور نہایت خوشی کا مقام ہو اگر وُہ صرف جو بعض غیر مفید اخبارات پر جو اچھے اہتمام سے شائع نہیں ہوتے۔ ہو رہا ہے۔ عُمدہ رسالوں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے۔ کہ موجودہ علمی رسالوں کی تعداد میں ایک رسالہ زیادہ کرتے ہُوئے اپنا رنگ جہانتک ممکن ہو سب سے جُدا رکھیں ۔

مُطالعۂ الفاظ

(۱)

ذیل میں ہم ایک تمہیدی مضمون مطالعۂ الفاظ پر درج کرتے ہیں۔ اِس کے لکھنے والے ہمارے مکرّم دوست مولوی احمد دین صاحب بی۔ اے وکیل مصنّف "اورنگ زیب" ہیں۔ مولوی احمد دین صاحب اپنے زمانۂ تعلیم میں نامور طُلبا میں رہے ہیں۔ اور فراغتِ تحصیل کے بعد لاہور کے نامی وکلا میں ہیں۔ اِس سلسلۂ مضامین کی تکمیل پر یقیناً سب ناظرین کی رائے ہوگی۔ کہ یہ اردو میں ایک مفید اور نئی چیز ہے۔ (ایڈیٹر)

علم و دانش کے بے بہا خزانے جو انسان کے دل و دماغ نے بہم پہنچائے ہیں ہم اچھی کتابوں میں کثرت سے بحفاظت تامہ جمع پائینگے اور یہ دولت بالعموم اسی سبیل سے بنی آدم میں نسلاً بعد نسلٍ متداول ہوتی نظر آئیگی۔ لیکن اِسوقت کتابوں یا مسلسل تقریروں سے ہمیں بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ ہمیں یہ جتلانا منظور ہے کہ صرف الفاظ میں ہی بلا لحاظ کسی فقرہ بندی یا عبارت کے اخلاقی اور تاریخی حقائق۔ اور انسانی جذبات اور ولولوں کے بیشمار گنجینے بھرے پڑے ہیں۔ اور اِن سے بیش قیمت نصیحتیں حاصل ہوسکتی ہیں بشرطیکہ ہم اُنکی طرف تھوڑی سی توجہ کریں۔ اس مضمون میں ہم اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرینگے کہ الفاظ جو ہم دن رات استعمال کرتے ہیں۔ پڑھتے ہیں یا سُنتے ہیں۔ خواہ وہ عالمِ رُوحانی کے متعلق ہوں۔ خواہ عالم جسمانی کے۔ یا معمولی الفاظ ہوں جو برزن و بازار میں بطور روزمرہ کی بول چال

میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسے ایسے قیمتی ہیروں کی کانیں ہیں جو دم بھر کے تجسس سے ہی ہمیں مالا مال کر دیں۔ الفاظ پر غور کرنا یا یوں کہو کہ مطالعہ الفاظ (کیونکہ اکثر اوقات الفاظ بجائے خود ایک کتاب کا مضمون لئے ہوتے ہیں) فی الحقیقت ہمیں بدرجہ اعلیٰ فائدہ پہنچائیگا۔

اکثر اوقات بیان کیا جاتا ہو کہ کسی چیز کی ناواقفیت ہماری نظروں میں اسکی قدر و منزلت کو بڑھا دیتی ہو۔ اس سے زیادہ غلط بات انسان کے مُنہہ سے کم نکلی ہوگی کیونکہ اسکے معنے یہ ہونگے کہ کسی چیز کی قدر و منزلت کرنیکا خاصہ جو انسان میں ہو اس کی جڑ صرف دھوکا و فریب ہو۔ اور کسی چیز کی ماہیت سے واقفیت حاصل کرنا اسکی قدر و منزلت کا خاتمہ ہو۔ مانا کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہو کہ ہم اپنی ناواقفیت کے سبب کسی چیز کو سراہنے لگتے ہیں اور بعد میں زیادہ واقفیت پر وہ شئے معمولی سی نظر آتی ہو۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہزارہا دفعہ ناواقفیت کی بدولت قابل قدر چیزوں کی ہم قدر نہیں کرتے۔ "علم شئے بہ از جہل شئے" ایک مشہور قول ہو۔ اور اسکی صداقت میں کسی ایک موقعہ پر بھی کسی وقت میں فرق نہیں آیا اور نہ آسکتا ہو۔ خواہ ہم عجائبات قدرت کو دیکھیں اور خواہ عجائبات صنعت انسان پر نگاہ ڈالیں۔ علم زبان میں بھی اسکی صداقت کسی صورت سے کم نہیں۔ بسا اوقات یہاں ہم ذہنی اور اخلاقی عجائبات کے درمیان بے توجہی کی نظر اور لاپرواہی کے خیال سے ادھر اُدھر پھرتے ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی مسافر مشہور میدان کارزار یا قدیم نامی شہر و ں میں سے بغیر طبیعت میں کچھ جوش پیدا ہونے کے گذر رہا ہو اسلئے کہ اسکو ان بڑے بڑے کارناموں کی کچھ خبر نہیں جو وہاں کے آسمان نے دیکھے ہیں اور وہ ان

دلوں سے ناواقف محض ہی جو اپنے اپنے ولولے خوش اسلوبی سے نکالکر اس زمین میں ملکر خاک ہو گئے ہیں - ہم بھی اسی مسافر کی طرح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجہ کے مفید جذبہ دل کے پیدا ہونے کی خوشی سے محروم رہتے ہیں - اور اس سے بڑھکر یہ کہ ان طرح طرح کی نصیحتوں سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جو ہر وقت ہماری راہ میں - اگر ہم صرف اپنے ہاتھ پھیلانا اور انہیں اپنے تصرف میں لانا جانتے ہوں - بکھری پڑی ہوئی ہیں - یہ دولت سب سے زیادہ ہمارے روزمرہ کے الفاظ میں ملتی ہی - تھوڑی سی واقفیت حاصل ہونے پر ہی ہم یکلخت پکار اُٹھینگے کہ معمولی الفاظ میں بھی جو غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل لوگوں کی زبان سے نکلتے ہیں - کیسے کیسے جواہرات لپٹے ہُوئے ہیں - اور کیا ہی خوبصورت پھول ہمارے قدموں میں پڑے ہُوئے ہیں جن کی اصلی لطافت اور پنکھڑیوں کی نزاکت ہر وقت پاؤں میں روندے جانے سے ناپید ہو رہی ہی +

الفاظ کے استعمال - انکی اصل - اور انکی باہمی تمیز پر غور کرنے سے زیادہ مفید اور دلچسپ کسی اور چیز کا مطالعہ نہیں - اور آج ہم اسی مضمون کی بحث کی ابتدا کرتے ہیں - بعض لوگوں کا شاید خیال ہو کہ اصل الفاظ نکالنے - انکے استعمالات کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور انہیں ایک دوسرے سے تمیز کرنے میں از حد محنت اور تکلیف اُٹھانی پڑتی ہی - لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ محنت و تکلیف کی کلفت اگر کچھ ہو بھی تو لطف و مسرت سے جو اس کام میں حاصل ہوتے ہیں بدل جاتی ہی اور شوق جو قدم قدم پہ بڑھتا چلا جاتا ہی ہمارے لُطف کو دوبالا کر دیتا ہی +

کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اِن خوبیوں سے مُعرّا ہو اور جسکے ہر ایک فقرے میں بیش بہا الفاظ کے موتیوں کی لڑیاں نہ پروئی ہوئی ہوں - ہندوستان کی مروّجہ زبان اُردو کو ہی لیجیے - گو اسے بہت پُرانی زبان ہونیکا دعوے نہیں مگر تھوڑی سی عُمر میں اس نے وُہ قبولیت حاصل کی ہی - کہ باید و شاید - اور دُوسری زبانوں کے الفاظ اور محاورات کو ایک خاص حد تک جذب کرنے میں وُہ مناسبت دکھائی ہی - جو بہت کم زبانوں میں پائی جاتی ہی - انگریزی کی طرح یہ بہت سی اَلسنہ سے مُرکّب ہی - پر اس میں ایران کی میٹھی اور پیاری زبان کا حصّہ بہت زیادہ ہی - اِس میں شک نہیں کہ اُردو کی بنا تو ہندوستان کی ایک قدیم اور سیدھی سادی بولی پر ہی - اور اب بھی جو کوئی اُس بولی کو تقریر و تحریر میں خُوبی کے ساتھ نباہ سکے ہُنرور گنا جاتا ہی - مگر فارسی کی آمیزش نے اس زبان میں وُہ آبداریاں پیدا کی ہیں - جنکے بغیر اِس تیغِ ہند کے سارے جوہر کبھی نہ کُھلتے - اسلیئے ہم اس مُطالعہ میں پہلے فارسی الاصل الفاظ کو لینگے - کیونکہ ایسے الفاظ جو دوسری زبانوں سے آکر زبان میں رَل مل گئے ہوں بسا اوقات دلچسپ تواریخ رکھتے ہیں - ہاں اتنا ضرور ہی کہ ہمیں اُنکی اصلیت اور ابتدائی معنوں کے دریافت کرنیکی تکلیف گوارا کرنی ہوگی - مگر اِسی تحقیقات میں کئی ایک الفاظ بھی ملینگے جن کی تاریخ سے ایسی قابلِ قدر واقفیت ہمیں حاصل ہوگی جو ایک جنگ کی تاریخ سے بھی نہیں ہو سکتی +

نئی دُنیا کے ایک مشہور مُصنّف نے زبان کو نظم متحجر کے نام سے موسوم کیا ہے - اور اس نام سے اسکا منشا یہ معلوم ہوتا ہی کہ جسطرح حیوانات و نباتات متحجر میں خاص نوع حیوانات یا نازک پودے جو شاید ہزارہا سال گذرے ہیں کہ زندہ اور ترو تازہ تھے

ہمیشہ کے لئے عالم جمادات سے تعلق پیدا کرکے ہلاکت و فنا سے بچ رہے ہیں - اسی طرح الفاظ میں بھی نازک خیالات اور دلفریب صورتیں - سلف کے جذبات و تصورات - گذشتگان کی اُمیدیں اور حسرتیں - گذشتگان جنکو قبروں میں سوتے ہُوئے صدیاں گذر گئیں اور جنکا نام تک فراموشی نے ملیامیٹ کر دیا ہی - زندہ اور قائم ہیں اور معدومیت کی دستبرد سے ابد الآباد کے لئے ایمن ہو گئے ہیں - یہ نام مناسب اور دلکش ہی - اور اگر اس میں کوئی نقص ہو سکتا ہو تو نقص تفریط کی زبان نظم متحجر ہو سکتی ہی اور فی الحقیقت ہی لیکن انہی معنوں میں اور اسی زور سے ہم اسکی نسبت یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان اخلاقِ متحجر یا تاریخ متحجر ہی - تاریخی واقعات اور اخلاقی خیالات بھی اسی کثرت اور اسی سہولیت سے صورت و جسم لفظی قبول کر لیتے ہیں جو جذبات و خیالات انسانی کو حاصل ہی - بلکہ یہانتک بھی ہوتا ہی کہ اگر کسی موقعہ پر انسان کی اخلاقی طبیعت میں کبھی سُقم واقع ہو جاوے تو الفاظ ہمیشہ کے لئے اس سقم کی زندہ شہادت قائم کر دیتے ہیں - ان سب اُمور پر ہم بالتفصیل بحث کرینگے - لیکن فی الحال ہم ایک دو مثالیں بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہمارا مطلب واضح ہو جاوے +

زبان جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہی نظم متحجر ہی - یا یوں کہو کہ اگر ہمیں کسی قوم کی نظم سے پوری واقفیت حاصل کرنا منظور ہو تو ہمیں صرف اُسکے اشعار یا نظم کی رنگینی میں رنگی ہُوئی روایات کو ہی نہیں دیکھنا ہی - ہمیں کئی ایک الفاظ بھی ملینگے جو فرداً فرداً نازک خیالی کے پرورش یافتہ - اور دلفریب نقش و نگار سے آراستہ ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان میں نظم کا عطر کھینچ کر بھر دیا گیا ہی - کسی لفظ کو لو اور اُسے

ذرا نظرِ غور سے دیکھو تو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ لفظ مذکور میں عالمِ ذہنی اور عالمِ اجسام کی کسی بڑی مشابہت و مناسبت باہمی کا نقشہ کھنچا ہوا ہی۔ عالم آخر الذکر کی رنگ آمیزی کی مدد سے اوّل الذکر کی تصویریں صاف و روشن اور قیام و دوام کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ ممکن ہی کہ اب تصویریں بے حیثیت اور معمولی سی دکھائی دینے لگی ہوں۔ اور شاید انہی الفاظ کی بدولت جو ہر ایک آدمی کے اثاثہ میں داخل ہو گئے ہیں ایسی معلوم ہو رہی ہوں۔ لیکن جس شخص نے پہلے اس مشابہت کو تاڑا اور اُسکے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ ایجاد کیا تھا یا کسی پُرانے لفظ کو جو پہلے اپنے لُغوی معنوں میں ہی استعمال ہوتا تھا اصطلاحی اور استعاری معنے دئے وُہ بزرگ ہر طرح سخن آفرین کے لقب کا مستحق ہی اور اس کی نازک خیالی و سخن وری بیشک اس قابل ہی کہ اسے سحر بیانوں کے زُمرہ میں شمار کیا جاوئے

مثلاً جس بندۂ خدا نے کسی کے برباد ہو جانے کا خیال اوّل ہی اوّل ظاہر کیا تھا ضرور ہے کہ اُسنے کئی دفعہ آندھی اور ہوا کو خس و خاشاک اڑاتے دیکھا۔ اُسنے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ یہ خس و خاشاک تنکا تنکا ایک دُوسرے سے جدا کوئی کہیں اور کوئی کہیں اپنے اصلی مقام سے کوسوں دُور طوفان باد کے جھونکوں سے اُڑتے پھرتے ہیں۔ اور پھر انکی جمعیت کا حاصل ہونا ناممکن ہو جاتا ہی۔ انکو قرار مشکل۔ اور انکا نام و نشان مفقود ہو جاتا ہی۔ خس و خاشاک کی اِس بیچارگی اور آوارگی کو اُس نے ایک مُصیبت زدہ انسان کی حالت سے مُقابلہ کیا۔ اور کچھ فرق نہ پایا۔ اِسکی نازک خیال طبیعت نے فوراً اُس نامراد و کمبخت انسان کی حالت بیچارگی کو بھی بربادی کے لفظ سے تعبیر کیا۔

بخت کے متعلق بھی بیدار و خوابیدہ کے الفاظ پہلے استعمال کرنے والے کے ذہن نے جاگتے اور سوتے اِنسان و حیوانات کی حالتوں پر غور کرکے یہ الفاظ بخت پر چسپاں کیے ہیں۔ جاگتے کی ہُشیاری۔ جلبِ منفعت و دفع مضرت میں چابکدستی۔ اپنی حفاظت۔ اپنی زندگی کے سامان مہیا کرنے کی فکر اور طاقت- سوتے کی بیکسی۔ کس مپرسی۔ بیچارگی۔ اور ہو بہو موت کی سی صُورت۔ ایک شاعرانہ مذاق کے لیئے کافی و وافی مثالیں خوش طالعی اور شومیِ بخت کی ہیں +

کام کی کتابیں

۔عُمر دو روزہ ہے۔ اور پھر اُس میں آرام و سکون کی گھڑیاں بہت کمیاب ہیں۔ اِسلیئے ہمیں کوئی گھڑی نکمّی کتابوں کے پڑھنے میں ضائع نہیں کرنی چاہیئے۔ ہر شائستہ ملک کے لیئے یہ ضروری ہے کہ اس میں کام کی کتابیں۔ مناسب قیمت پر۔ خوبصورتی سے چھپی ہوئی ہر شخص کو میسّر آسکیں اور بُری چھپائی کی کتابیں۔ یا بینائی کو ضرر پہنچانے والی کتابیں رذیلانہ قیمتوں پر مروّج نہ ہوں حقیقت یہ ہے کہ ہمیں بہت کتابیں درکار نہیں۔ مگر جو درکار ہیں۔ وُہ صاف چھپی ہُوئی۔ عُمدہ ترین کاغذ پر لکھی ہُوئی اور مضبوط جلد والی ہونی چاہیئیں۔ مانا کہ ہم سب کچھ بہت متموّل نہیں۔ لیکن ہم میں کون ایسا ہے جو ناشستہ اپنے دسترخوان پر مہمانوں کے رُوبرو بُرا کھانا چُن دے اور اسے باعثِ ندامت نہ سمجھے۔ اِسی طرح کسی کو بُری چھپائی یا بھدّی سلائی کی کتابیں اپنی الماری میں رکھنی مناسب نہیں۔ نظامِ عالم ایسا ہے کہ ہم سب کے سب امیر نہیں ہو سکتے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ جو کوئی دیانت اور محنت سے کام لے وُہ اتنا ضرور پیدا کرسکتا ہے۔ کہ اپنے لیئے اور اپنے متعلقین کے لیئے اچھّی جُوتیاں اور اچھے دستانے۔ اپنے گھوڑے اور گاڑی کے لیئے مضبُوط زین اور ساز اور اپنی کتابوں کے لیئے پائدار چمڑے کی جلدیں بنوا سکے۔ میں ہر نوجوان کو نصیحت کرتا ہُوں کہ اثاث البیت کی فکر کرنے کے وقت سب سے پہلے نہایت کفایت شعاری کو ساتھ عُمر بھر کے استعمال کے لیئے مفید کتابوں کا ایک مختصر مگر آہستہ آہستہ بڑھتے رہنے والا ذخیرہ جمع کرے۔ اور اپنے کمرہ کی آرائش میں سب سے زیادہ توجہ اپنے چھوٹے سے کُتب خانہ پر رکھے + (رسکن)

دہلی - غدر سے پہلے

لالہ سری رام صاحب ایم - اے - خلف الرشید آنریبل رائے بہادر لالہ مدن گوپال صاحب دہلوی نے بعض پرانے انگریزی علمی رسالوں سے غدر سے پہلے کی دہلی کی مغلیہ سوسائٹی کے متعلق کچھ دلچسپ حالات اخذ کرکے بھیجے ہیں - اوّل نوجس خاندان کے حالات انہوں نے لکھے ہیں اُنکی دلچسپی تاریخ ہند کے مطالعہ کرنیوالوں کے لئے کبھی ختم نہیں ہوسکتی - اور ایک انگریزی خاندان پر اس خاندان کی شاخ کا پیوند لگنے کے ذکر سے اور بھی دوبالا ہوگئی ہے - دوسرے اس مضمون میں اسوقت کی رسومِ شادی کی ایک دلاویز تصویر ہے - اور جو لوگ ہندوستان کی رسوم سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں - وُہ اب بھی ان تمام رسوم کے بقیئے ہندو مسلمان اُمرا کے ہاں پائینگے - ان رسموں میں سے اکثر ایسی تھیں جو مغل اپنے مُلک سے نہیں لائے تھے - بلکہ جو انہوں نے ہندوستان میں اہل ہند کے ساتھ میل جول کے سبب اختیار کرلی تھیں - اور جنکو پھر اُس انگریزی خاندان نے جو گارڈنر کے نام سے مشہور ہے اختیار کیا - ان رسموں کا ذکر پڑھتے ہوئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ابتدا ہیں ہندوستان میں باہر سے آنیوالی اقوام اہل ہند کے رنگ میں کس آسانی سے رنگی جاتی تھیں - اور اب زمانہ نے کیا پلٹا کھایا ہے - کہ اہل ہند کا کوئی رنگ کسی کو پسند نہیں آتا - اور دُوسروں کے سب انداز اہل ہند کی نظروں میں کُھبے جاتے ہیں - (ایڈیٹر)

اکتوبر ۱۸۴۴ء کے "ایشیاٹک جرنل" میں کرنل گارڈنر کے یہ حالات اور ایک دلچسپ مُغلیہ شادی کی کیفیت ایک لیڈی نامہ نگار کی طرف سے شائع ہُوئی تھی۔ کرنل گارڈنر جو معزز خاندان نوّاب گارڈنر میں سے ہیں۔ سرکاری ملازمت کی تقریب سے ہندوستان میں آئے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی روز بعد اُنہوں نے ملازمت ترک کردی۔ اُس زمانہ میں اکثر انگریزی افسر ہندوستانی سرکاروں میں بڑے عُہدہ پانے کی اُمید سے نوکری کر لیتے تھے دُوسرے اُسوقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ کبھی ایسا موقعہ آئیگا کہ افواج سرکار ہائے رؤسا ہند سے کمپنی کی فوج کا مُقابلہ ہوگا۔ لیکن جب بعد میں ایسا موقعہ آیا تو مہاراجہ ہلکر اور دیگر رؤسا ہند نے جنکے ہاں انگریزی افسر مُلازم تھے اُن سرداران فوج کو اِس امر پر مجبور کیا کہ وُہ اپنے ہموطن اور ہم قوم افواج انگریزی سے مُقابلہ کریں۔ گارڈنر صاحب بھی ایک ایسے موقعہ پر مہاراجہ ہلکر کے ہاں مُلازم تھے اور وہاں سے وُہ بڑی پھُرتی۔ فطرت اور چالاکی کے ساتھ بچکر نکل آنے میں کامیاب ہُوئے۔ ایک روز یہ زیرِ حراست سوارانِ ہلکر ایک پُل پر گذر رہے تھے اُسوقت اُنہوں نے وہاں سے رہائی پانے کی یہ تدبیر سوچی کہ پُل پر سے دریا میں کُود پڑیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور دریا کو چیر کر دُوسرے علاقہ میں پہنچے لیکن جب دشمنوں نے وہاں بھی اِنکا تعاقب کیا تو اِنکو سوائے اِسکے کہ گھسیارے کے بھیس میں بھاگ کھڑے ہوں اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ اِس حالت میں انجام کار یہ ایک انگریزی چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ اِس قسم کی سرگردانی اور بے سرو سامانی کی حالت میں انہوں نے دکن کے ایک چھوٹے سے مسلمان جاگیردار کے ہاں پناہ لی اور وُہ ان پر یہانتک مہربان ہُوا کہ اُسنے اپنی لڑکی کی

شادی ان سے کر دی - یہ نواب زادی ابتک اپنے دین آبائی پر قائم ہی - اور اُن تمام رسُومات کی جو کہ ہندوستانی محلسراؤں میں مرّوج ہیں پابند ہی *

کرنل صاحب نے بھی بہت سی عادتیں اور رسمیات جو ہندوستان میں مرّوج ہیں اختیار کر لی ہیں - اور انکا طرزِ معاشرت بالکل ایشائی طرز پر ہو - اگرچہ وُہ انگریزی افسروں سے بڑی خندہ پیشانی اور شوق سے ملتے رہتے ہیں" *

کرنل صاحب نے مندرجہ بالا بیان کی "مُفصّل اخبار" میں اس طرح پر تصحیح کی :-

"جسوقت میں دریائے تاپتی میں کودا اُسوقت میں فوج ہلکر کی زیرِ حراست تھا بلکہ امرت راؤ قرابت دار پیشوا ایئے پونا کے قبضہ میں تھا - جسوقت میں نے بیگم صاحبہ سے شادی کی اُسوقت انکی عُمر تیرہ سال کی تھی - مَیں نے انکی والدہ سے اس امر کی التجا کی کہ وُہ مجھے اپنی فرزندی میں لیں - اس درخواست کو اُنہوں نے منظور کیا اور غالبًا یہ ان دونو کی جان بچنے کی وجہ ہُوئی - عیسائی شرفا کا مُسلمان شریف زادیوں سے شادی کرنا پُورے طور پر جائز ہی اور اس امر کا صاف طور پر فیصلہ اُسوقت ہو گیا کہ جب میرے لڑکے جیمس کی شادی شاہِ دہلی اکبر بادشاہ کی بھتیجی نواب ملکہ زمانی بیگم سے ہوئی - مَیں یہ بھی کہنا چاہتا ہُوں کہ میرے خاندان کی مستورات کی عزّت و توقیر بہت عرصے سے اسوجہ سے بہت بڑھ گئی ہی اور ہندوستانی رؤسا کی نظر میں مسلّم ہو گئی ہی کہ شاہ متوفی ہندوستان نے میری بیوی کو اپنی صاحبزادی کے خطاب سے مُمتاز فرمایا تھا - میری اکلوتی لڑکی کا ۱۸۴۰ء میں انتقال ہو گیا میری پوتیاں اپنی دادی کی خاص رضا کے مطابق مذہب عیسوی کے پیرو ہیں یہ امر خاص انکی مرضی کے مطابق ہوا ہی کیونکہ نکاح نامہ کی شرائط کے بموجب یہ فیصلہ

ہو گیا تھا کہ لڑکے اپنے باپ کے مذہب کے پیرو رہینگے اور لڑکیاں اپنی والدہ کے عقیدہ پر چلیں گی *

اس خاندان کی ایک لڑکی سوسن کی شادی مرزا انجم شکوہ خلف مرزا سلیمان شکوہ سے ہُوئی - مرزا انجم شکوہ ظفر کے چچیرے بھائی تھے - اُس کی کیفیت ایک لیڈی نے جو خود رسُوم میں شامل تھی یُوں بیان کی ہے :-

سوسن کی عُمر اِسوقت قریب بیس سال کے ہے اور اگر اِس بات پر نظر کیجائے کہ وُہ زنان خانہ کی چار دیواری میں رہی ہے تو اسکی تعلیم و تربیت اِس لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی ہوئی ہے - انجم شکوہ یعنے دولہا کی عُمر بھی قریب بیس سال کے ہے - یہ ایک نہائت ہی حسین اور خوشرو جوان ہے - لمبے لمبے بھونرا لے بال شانوں کے اُوپر پڑے رہتے ہیں - آنکھیں بہت بڑی بڑی ہیں اور میانہ قد ہے اور نہایت دلکش شکل ہے - چار پانچ برس سے انجم شکوہ اِس منگنی پر زور دے رہا تھا - مگر کرنل صاحب اسکی فضول خرچی کی وجہ سے راضی نہ ہوتے تھے - انجم کے والد بزرگوار مرزا سلیمان شکوہ نے ان دولہا دولہن کے خرچ کی کفالت کرنے سے بالکل انکار کر دیا ہے اور طرفین کا خرچ کرنل صاحب کو اُٹھانا پڑتا ہے - شاہزادے کو صرف سَو روپیہ ماہوار ملتا ہے - ہندوستان کی عورتیں شادی پر بیجا اسراف کرنا اور غیر معمولی تکلّفات کرنا باعثِ فخر سمجھتی ہیں - کرنل صاحب کہتے ہیں کہ اگر میں سوسن کو دس بیس ہزار روپیہ جو آتشبازی اور ہو حق میں اِس شادی پر صرف ہو گا نقد دیدوں تو وُہ اس کو بہت شرمناک خیال کریگی کیونکہ ہندوستانی عورتیں مُدت العمر تک اپنی شادی کی دھوم دھام کا فخریہ تذکرہ کرنے کی شائق ہوتی ہیں *

(۱۲- مارچ ۱۸۹۵ء) آج رسمیات شروع ہوئیں - براتی لوگ مسٹر جے گارڈنز اور ملکہ ممانی بیگم اور انکے بھائی شریک ہیں - یہاں سے چار میل پر خیموں میں فروکش ہوئے اور ہم سب دولہن کی جانب والے یہاں کاس گنج میں ہیں - نواب کھیسے کے علاوہ مسٹر وی گارڈنز اور بہت سے اصحاب انگریز بھی دیوانخانے میں ٹھہرے پڑے ہیں - آج تین بجے سہ پہر کے ملکہ بیگم بڑے جلوس کے ساتھ دولہن کی پوشاک لیکر آئیں - اس جلوس میں ہاتھی - رتھ - پالکیاں اور گھوڑے تھے - اور ایک سَو کشتیاں مٹھائی کی تھیں - علاوہ اسکے دولہن کو نہلانے کے لئے اوبٹنا اور بیسن ایک طشت میں تھا - کم حیثیت عورتیں یہاں کی رسم کے مطابق جب کسی محلسرا میں جاتی ہیں تو مالک خانہ کو بجائے سلام کرنے کے رسمِ قدمبوسی بجالاتی ہیں - دائیں ہاتھ سے پیر کو ہاتھ لگا دیتی ہیں اور پھر ہاتھ کو چُومتی ہیں - عموماً مہمان نواز اور خلیق بیگمات ذرہ نوازی فرما کر ہاتھ لگانے نہیں دیتیں اور یہ دُعا دیکر بیٹھنے کا اشارہ کردیتی ہیں - "خدا تمہارا سوہاگ قائم رکھے") *

یہ لوگ پردے کے اسقدر پابند ہیں کہ سوائے قریبی رشتہ داروں کے اور کوئی رشتہ دار محلسرا میں جا نہیں سکتا - صرف باپ اور دادا بغیر روک ٹوک کے جاسکتے ہیں - چچا تاؤ اور بھائی صرف خاص موقعوں پر - دولہن کو ایک دفعہ دولہا کے بھائیوں نے دیکھا تھا - دولہا نے اب کہلا بھیجا کہ سوائے کرنل صاحب اور مسٹر جیمس کے اب ہر ایک سے پردہ کرنا لازم ہے - کشتیاں لونڈیاں باندیاں اپنے سروں پر اُٹھا کر محلسرا میں لیگئیں اور وہاں بڑی بیگم اور شاہزادی ملکہ بیگم کے سامنے انہوں نے قرینے سے سب کو لگا دیا - دولہن دوشالہ سر سے پاؤں تک لپیٹے

ایک چھپرکھٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں اور رو رہی تھیں۔ میں نے یہ خیال کیا کہ شاید یہ شادی اسکی مرضی کے خلاف ہوئی ہو مگر بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ رونا بھی رسمیات میں داخل ہے۔ ملکہ بیگم نے ایک چاندی کا کٹورہ اپنے ہاتھ میں لیا اور اُس میں چندن کافُورا اور تیل ملایا۔ اور بیگم نے اور شاہزادی نے دونو طرف کے نام اور خطاب احتیاط سے دوہرانے شروع کیے۔ انکا یہ خیال ہے کہ اگر کوئی نام یا خطاب سہو سے رہجائے تو بڑی بدشگونی ہوتی ہے۔ اسکے بعد دولہن کے اوبٹنا ملا گیا۔ اس سے جسم بہت مُلائم ہوجاتا ہے۔ پھر استعمال شدہ اوبٹنا اُتار کر ایک پیالے میں رکھ کر دولہا کے بدن پر ملنے کے لئے باہر بھیجا۔ اسکے بعد شادی کا لباس دولہن کو پہنایا گیا۔ یہ زرد گاچ کا تھا اور روپہری گوٹا اُس پر لگا ہُوا تھا۔ پاجامہ سُرخ ساٹین کا تھا۔ اسکے بعد ملکہ بیگم خیمے کو واپس چلی گئیں۔ اب سے دس روز تک دولہن کو چارپائی سے اُٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسکو مائیوں بٹھانا کہتے ہیں۔ دن میں دو بار روز اوبٹنا اور صابن اسکے بدن پر ملا جاتا ہے لیکن غُسل نہیں کرایا جاتا۔ سوائے مٹھائی کے اَور کوئی چیز حتّٰی کہ پان بھی نہیں کھلایا جاتا۔ ملکہ بیگم کے جانے کے بعد کرنل صاحب نے مجھے کہا کہ اب تم آلیڈا کے ساتھ دولہا کا جوڑا لیکر اُس کے خیمے پر جاؤ۔ اُسی تکلّف سے ہم گئے ملکہ بیگم نے خیمے کے دروازے تک پیشوائی کی۔ دولہا چاندی کی چوکی پر بیٹھا ہُوا تھا ملکہ نے اوبٹنا لگایا اور پھر دولہا کو پوشاک پہنائی۔ زرد اور نارنجی رنگ کی ململ کا جامہ تھا اور گلابی ریشم کا پاجامہ اور سُرخ مندیل تھی۔ دولہا کے سامنے ڈومنیاں گا اور ناچ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم واپس چلے آئے (موسم بسنت

میں ہولی بڑی دھوم سے منائی جاتی ہو۔ لوگ ایکدوسرے کے منہ پر گلال ملتے ہیں اور رنگ ڈالتے ہیں اور طرح طرح کے مذاق اور دل لگیاں کرتے ہیں عبیر اُڑاتے ہیں۔ اور رنگ پچکاریوں میں بھر کر اور قمقموں میں ڈال کر پھینکتے ہیں اور ڈومنیاں شادی اور منگنی کے موقعوں پر نہایت فحش اور بیہودہ گیت گاتی ہیں؛

رنڈیاں اُمرا و شرفا کے زنانخانوں میں نہیں جانے پاتی ہیں۔ لیکن بڑے گھرانوں میں مثلاً کرنل صاحب اور انکے بیٹے کے ہاں لونڈیاں گانا بجانا عمدہ طرح پر جانتی ہیں۔ کیونکہ انکو بیگمات کی تفریح کے لیے گانے ناچنے کی تعلیم دلوائی گئی ہو۔ کرنل صاحب کہتے ہیں کہ رنڈیاں جو گیت گاتی ہیں وہ ہرگز خلافِ تہذیب یا فحش نہیں کہے جا سکتے۔ سوائے ان موقعوں کے کہ اُن سے فحش گیت گانے کی فرمائش خاص طور پر کیجائے (مثلاً کہروا)؛

(۲۸ - مارچ ۱۸۳۵ء) ساچق کے دن سے لڑکی دولہن کہلانے لگتی ہو۔ آج ملکہ بیگم اور دولہا گاجے باجے کے ساتھ اور دیگر براتی بہت زرق برق پوشاک پہنے ہوئے آئے۔ لڑکی والے پُرانے اور میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اُنکے چہروں سے اُداسی ٹپکتی تھی۔ چونکہ یہ بھی ایک دستور ہو اسوجہ سے اسکی پوری پابندی کیجاتی ہو۔ جلوس میں کئی ہاتھی عماریدار تھے اور بیش بہا جھولیں اُن پر پڑی ہوئی تھیں۔ نالکیاں اور پالکیاں بھی متعدد تھیں اور عربی گھوڑے اور رتھ تھے۔ اور دو سو آدمیوں کے سروں پر دو سو ٹھلیاں مٹی کی تھیں۔ جن پر روپہری پنّی لگی ہوئی تھی۔ ان ٹھلیوں میں مٹھائی تھی۔ تختِ رواں پر رنڈیاں ناچتی ہوئی آتی تھیں؛

تختِ رواں پر شامیانہ لگا ہوتا ہو۔ ہر ایک تخت پر ایک طبلچیہ اور دو رنڈیاں

ہوتی ہیں۔ تختِ رواں کو بہت سے مزدور ملکر اُٹھاتے ہیں۔ تختِ رواں دس تھے جن میں بیس طائفے تھے۔ ملکہ کی پالکی کے آنے کے بعد صندل کا عطر سب لوگوں کے مُنہہ پر لگایا گیا۔ اور گوٹے کے ہار سب کے گلوں میں ڈالے گئے۔ اس کے بعد ڈومنیوں نے پھر گالیاں دیں اور فحش گیت گانے شروع کئے۔ دولہا اور ملکہ کو اور مجھے بہت گالیاں ملیں مگر چونکہ خفا ہونا معیوب سمجھا جاتا ہی۔ اس وجہ سے کسی نے خفگی ظاہر نہ کی۔ دُولہا نہایت عمدہ پوشاک پہنے ہُوئے تھا۔ لیکن رواج کے مطابق وُہی زرد لباس جو سُسرال سے گیا تھا اُسکے نیچے پہنے ہُوئے تھا۔ عمامہ کے سامنے مرصّع جیغہ اور سرپیچ تھا۔ اور بازوں پر بیش قیمت بازوبند تھے ٭

دُو ۲۹ - مارچ ا آج مہندی لگانے کی رسم تھی۔ دولہن کی طرف سے طشتریوں میں مہندی رکھ کر اور مخملی سرپوش ڈھک کر دُولہا کے لئے بھیجی گئی۔ رات کے گیارہ بجے دولہن کے تمام رشتہ دار بڑے جلوس کے ساتھ کاس گنج سے دُولہا کے خیموں کی طرف گئے۔ سب رشتہ دار نہایت مُکلّف پوشاکیں پہنے ہُوئے تھے۔ سڑک پر دوطرفہ روشنی کے لئے ٹھاٹر لگے ہُوئے تھے اور جابجا آتشبازی چھوٹتی جاتی تھی۔ سڑک پر بیسیوں دروازے اور محرابیں نصب کی گئی تھیں۔ اور سب پر روشنی کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں پانچہزار کے قریب مشعلیں روشن تھیں۔ بڑی بیگم صاحبہ بذاتہٖ خاص ایک نالکی پر اور اُنکے گھرانے کی دیگر بیگمات رتھوں پر سوار تھیں۔ تاشہ والے اور زرنیا بستی تخت بھی ہمراہ تھے۔ یہ جلوس دولہا کے خیموں کے قریب جو چار میل کے فاصلہ پر تھے۔ دو گھنٹے میں پہنچا۔ ہزارہا آدمیوں کی بھیڑ جلوس کے ساتھ تھی۔ ملکہ بیگم کے خیمے زنانہ مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے آراستہ کئے گئے تھے۔ باریک چلمنیں جن پر

رنگدار ململ لگی ہوئی تھی۔ سب دروازوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان چلمنوں میں سے مستورات جو اندر تھیں باہر کی تمام سیر دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن باہر سے کوئی شخص اندر کا حال بالکل نہ دیکھ سکتا تھا۔ خیمے کے سامنے ایک بہت بڑا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اور اُس میں چاندنی کا فرش تھا۔ شامیانہ کے وسط میں ایک مُکلّف گدّی پر دولہا نہایت عُمدہ پوشاک پہنے ہُوئے بیٹھا تھا۔ اور نہائت خوبصُورت معلُوم ہوتا تھا۔ اُس کے چار بھائی جو بہت بدصُورت تھے اُسکے پاس بیٹھے ہُوئے تھے۔ اُنکے برابر ہی ایک سادی گدی پر کرنل گارڈنر بیٹھے ہُوئے تھے۔ اور داہیں بائیں دیگر صاحبان انگریز و ہندوستانی بیٹھے ہُوئے تھے۔ ایک سَو کے قریب رنڈیاں جو دُور دُور سے بلوائی گئی تھیں یہاں موجُود تھیں۔ آٹھ سات رنڈیاں ساتھ ناچ رہی تھیں۔ جب اندر تیاری ہو چُکی۔ تو کرنل گارڈنر میرے اور شاہزادوں کے ہمراہ خیمے میں گئے۔ خیمے کے بیچ میں ایک قنات کھڑی کر دی گئی تھی جنکے پیچھے مستورات بیٹھی تھیں۔ دولہا کو ایک چاندی کی چوکی پر بٹھا کر شکر کھلائی۔ اِس میں یہ بات مزے کی تھی کہ جسوقت دُولہا کھانے کے لئے مُنہہ بڑھاتا تھا اُسیوقت ہاتھ سرکا لیا جاتا تھا۔ اور اِس پر قہقہہ پڑتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چاندی کی طشتری میں مہندی گھولی گئی۔ ملکہ بیگم الیڈا اور اُسکی بہن نے شاہزادے کے ہاتھ پیروں میں یہ مہندی ملی۔ اور پھر ایک نہائت ہی خوبصُورت نُقرئی آفتابہ سے اُس پر پانی ڈالکر دھویا۔ سُنہری۔ سبز رنگ کا بیش قیمت دستار جس میں سبزہ اور دیگر جواہرات لٹک رہے تھے۔ دولہا کے سر پر رکھا گیا۔ اسکے بعد کمخواب کا جوڑہ پہنایا۔ اور سُرخ کلابتونی کمر بند اور سبز پاجامہ پہنایا۔ اور ایک قیمتی انگشتری اور جڑاؤ بازوبند بھی دولہا کو پہنائے۔ پھر سبکو شربت

پلایا گیا۔ شربت کے طشت میں ہر ایک نے ایک ایک مُہر ڈالی۔ یہ سب مُہریں بطور نیگ کے اُن لڑکیوں کو جنہوں نے مہندی لگائی تھی ملتی ہیں۔ پھر ایک لونڈی ایک چاندی کا برتن جس میں پانی بھرا ہُوا تھا لیکر آئی۔ اور اس میں سے پانی ہر ایک مہمان کے ہاتھ پر ڈالا گیا اور ہر ایک مہمان نے چار چار پانچ پانچ روپے اُس میں ڈالے۔ یہ روپے ڈومنیوں کو جو ایک کونے میں بیٹھی ہُوئی گا رہی تھیں دیئے گئے۔ چمبیلی کے تازہ ہار سب مہمانوں کے گلوں میں ڈالیگئے۔ اسکے بعد کرنل اور دولہا باہر چلے گئے۔

کھانا کھانیکے بعد تمام مہمانوں کو جو دیوانخانہ اور محلسرا میں جمع ہُوئے تھے نہایت خوبصورت گوٹے کے ہار تقسیم ہُوئے۔ تھوڑی دیر بعد میں بیگم سے رخصت لیکر کرنل گارڈنر کے پاس چلی گئی اور وہاں تین بجے تک ناچ دیکھتی رہی۔ تین بجے صبح کے وہاں سے پالکی میں سوار ہو کر خاص گنج چلی آئی"۔ (باقی آیندہ)

تین آرزوئیں:۔ ایک یتیم خانہ میں ایک دن تین لڑکیاں جاڑے کے موسم میں دُھوپ میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک بولی "بہن! اگر خدا وہ دن لائے کہ ہم مُنہ مانگی مُراد پائیں تو تم خدا سے کیا مانگو گی"۔ دُوسری نے جواب دیا "میری آرزو تو یہ ہے کہ میرے پاس بیشمار مال و دولت ہو۔ اور مَیں طرح طرح کے زیور بنواؤں اور گوٹے کناری سے منڈھے ہُوئے ریشمی کپڑے پہنوں۔ تاکہ جو دیکھے ایک دفعہ تو دنگ ہو جائے"۔ پہلی کہنے لگی "گوٹے کناری کو آگ لگے۔ گوٹے کناری میں کیا رکھا ہے۔ آجکل سب لوگ سادگی پسند کرتے ہیں۔ مَیں تو دُعا مانگتی ہُوں کہ خدا مجھے روپیہ دے تو مَیں مکّہ کے حج کو جاؤں اور جو غریب لوگ راستہ میں ملیں اُنہیں خوب دل کھول کر خیرات دُوں۔ اور وہاں سے یہاں کی ساری بہنوں کے لئے تحفے تحائف لاؤں"۔ تیسری لڑکی جو اسوقت تک خاموش تھی بولی "ہمیں تو اگر یقین ہو کہ خدا ہماری سُنیگا۔ تو یہی دُعا کریں کہ خدا ہمیں ماں دے۔ جو ہمیں گودی میں سُلائیں"۔

فنِ تقریر

خدا نے انسان کو گویائی عطا کرنے میں تو اپنے لطفِ عمیم کا ثبوت دیا ہی تھا۔ مگر اپنے بعض چیدہ بندوں کو قوتِ بیانیہ دیکر موردِ الطاف خاص بنایا ہی۔ اور قوتِ بیانیہ کے ذریعہ سے حکمتِ ایزدی نے دُنیا میں وُہ وُہ کام نکالے ہیں۔ جنکے کرنے سے اَور قوتیں عاجز تھیں۔ مثلاً تیغ و آتش فاتحانِ دُنیا کے ہاتھ میں بڑی طاقتیں رہی ہیں۔ اِن سے اُنہوں نے سرکشانِ جہان کو نیچا دکھایا۔ زبانِ تیغ نے بڑے بڑے بدزبانوں کے مُنہہ پر مُہرِ سکوت لگائی اور زبانۂ آتش کے بلند ہوتے ہی سب مغروروں کو سرِ غرور جُھکاتے ہی بنی۔ مگر یہ تمام فتوحات ہیچ ہیں اُن فتوحات کے سامنے جو مختلف زمانوں میں تیغِ زبان کو نصیب ہوئیں۔ زبانِ تیغ کا اثر دو یا چار برس تک ہُوا تو تیغِ زبان نے دو ہزار چار ہزار دس ہزار کو ایک وقت میں مطیع کیا۔ پہلا اثر اگر محدود عرصہ کے لیئے ہُوا تو دُوسرا زمانہ دراز پر حاوی رہا۔ جو فتوحات پیغمبروں کی مبارک زبانوں کی آبدار تلواروں نے دنیا کے مختلف حصّوں اور مختلف زمانوں میں حاصل کی تھیں۔ وُہ آج تک قائم ہیں۔ بلکہ دن بدن بڑھتی رہتی ہیں۔ حالانکہ فاتحانِ دہر کے نام و نشان تک رفتہ رفتہ صفحۂ دہر سے محو ہوتے جاتے ہیں اور زمانے کے بیرحم ہاتھوں نے بعض کی دُھندلی نشانیاں تک مٹا چھوڑی ہیں۔ پیغمبروں اور مذہبی پیشواؤں کی یہ آبدار تلواریں تو نہایت اعلیٰ نمونہ زبان کے معجزات کا ہیں۔ کیونکہ اُنکی چمک خاص نُورِ الٰہی سے تھی۔ مگر دُنیا داروں میں بھی وُہ لوگ جنہیں جوہرِ فصاحت

دیا گیا ہی۔ اپنے اپنے عہد میں بہت کچھ کر گئے ہیں۔ اُنکے کام کے اثرات تاحال موجود ہیں اور زمانہ انکو یاد رکھیگا اور اُن میں جس کسی کے اقوال قلمبند ہو گئے ہیں اسکے نام کے نہ مٹنے کی تو گویا ضمانت موجود ہی۔ جب تک دنیا میں علم ہی۔ اور علم کے شوقین لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ جب تک مطالعہ مفید سمجھا جاتا ہی۔ اور زباندانی مطالعہ کے لئے ضروری مدد تصوّر کی جاتی ہی۔ جب تک لوگوں میں زبان کی خوبیوں کا مذاق ہی اور یہ مذاق قابلِ قدر شمار ہوتا ہی۔ اُسوقت تک لوگ ان شیریں سخنوں کا کلام پڑھنے سے سیر نہ ہونگے۔ نسلیں گذرتی جائینگی۔ مگر اس شوق میں کمی نہ آئیگی۔

یوں تو ہر زبان میں مادہ فصاحت ہی اور ہر زبان کو فصاحت سے بولنے والے گذرے ہیں۔ مگر ایشیائی زبانوں میں یہ قوت بالطبع دوسری زبانوں سے بڑھکر ہی اور ایشیائی طبیعتوں میں اس قوت کے بڑھانے کی قابلیت قدرتی طور پر بہت ہی۔ مگر تعجب کی بات ہی کہ فصاحت بہ حیثیتِ فن ایشیا میں ایک عرصہ سے متروک ہی۔ اور اہلِ فرنگ نے اس فن کو صدیوں کی مشق سے اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عرب و عجم میں فصحا نہیں گذرے یا اسوقت بالکل معدوم ہیں۔ یا ہندوستان میں پُرتاثیر واعظ و خطیب نہیں ہوئے یا اب نہیں ہیں۔ مگر تعداد وہ نہیں جو ممکن تھی۔ باجود ان ممالک سے بہت کم رقبہ کے ممالکِ اہلِ فرنگ میں ہی۔ نیز یہ کہ فرنگستان میں تو فصحا کے طبقے میں اکثر ایسے اصحاب ہیں جنکی قابلیت عطایائے قدرت اور باقاعدہ مشقِ فن کی مناسب ترکیب کا نتیجہ ہی اور یہاں جو کوئی خال خال خوش بیان آدمی پایا بھی جاتا ہی۔ اسکی مثال سبزۂ خودرو کی مثال ہی۔ قدرت نے کہیں جوہرِ فصاحت طبیعت میں رکھدیا۔ یا زبان میں تاثیر بخشدی۔ اور

اتفاقیہ کسی تقریب سے تقریر کا موقعہ بھی پڑ گیا۔ جس سے جوہر دار کو خود اپنے جوہر کا علم ہو گیا۔ تو یہاں کے لئے فصاحت کے مرد میدان بن گئے۔ اب دیکھتے ہیں تو مشق کا موقعہ بہت کم۔ کہیں برس چھ مہینے میں ایک دفعہ کوئی بڑا مجمع تقریر کے لئے مل جائے تو وہی تختۂ مشق ہے اور وہی تقریب اظہار فن۔ دس بیس جلسوں میں بولنے کا اتفاق ہو گیا۔ تو پختہ کار سمجھے جانے لگے۔ برعکس اس کے مغربی دُنیا میں اوّل تو والدین یا اُستاد بچوں کی طبیعت کا موازنہ کر کے اگر انکی مناسبت گویائی کی طرف دیکھیں تو انہیں مدرسہ ہی میں مشق کے موقعے دینے لگتے ہیں اور انہیں بعد تحصیل علم ایسے کاموں میں لگاتے ہیں۔ جہاں گویائی کی مشق ہوتی رہے۔ اس منزل پر پہنچ کر اگر انہیں شوق ہوتا ہے تو فن تقریر پر ضخیم کتابیں موجود ہیں جنکا وہ مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مدرسے اس فن کے لئے مخصوص ہیں۔ جہاں اس فن کے ابتدائی مرحلے آسانی سے طے ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑھکر ملک کے لٹریچر میں ایک بہت بڑا ذخیرہ فصحا کے لکچروں اور خطبوں کا موجود ہے۔ جن پر عبور طالب فن کے لئے اکسیر ہے۔ ان مدارج کو طے کرنیکے بعد عدالتیں۔ کونسلیں۔ اور پارلیمنٹیں ایک سے ایک اچھا ذریعہ قوت تقریر کے مانجھنے کا ہیں اور ایک ان پر کیا منحصر ہے۔ پبلک جلسے اس کثرت سے ہوتے ہیں اور ان میں اہل علم اس ذوق و شوق سے آتے ہیں۔ اور ذرا ذرا سی خوبی کی اسقدر زور سے داد دیتے ہیں۔ کہ الکن بھی کلیم بن جائے تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ قدیم روما کے ایک مشہور فصیح کا قول ہے۔ کہ "فصاحت آزادی کا ایک بہترین ثمر ہے" یہ وہ درخت ہے۔ جو اُسی سرزمین میں جڑ پکڑتا ہے۔ جس پر آزادی کی حکومت ہو۔ اور جسے آزادی ہی کی آب و ہوا راس ہے۔ ایک حدتک تو مغربی دُنیا اور مشرقی دُنیا کی فن تقریر

کے متعلق ترقی کے نمایاں فرق کی وجہ اس قول سے سمجھ میں آتی ہے۔ یعنے مغربی ممالک کی ترقی فن فصاحت میں اُن ممالک کی آزادی کے مطابق ہے۔ اور یہاں کی ترقی یہاں کی آزادی کے تناسب سے ہے۔ اس انگریزی حکومت میں جو ہمیں آزادی کی نعمت نسبتاً زیادہ حاصل ہوئی ہے تو ہندوستان میں مجالس کے چرچے شروع ہوئے ہیں۔ لکچراروں کی ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ اور فصیح اور خوش بیان خطیبوں کی مانگ ہے۔ اور جوں جوں ہمارے ملکی حقوق وسیع ہوتے جائینگے۔ توں توں فن تقریر میں ترقی ہوتی جائیگی۔ مگر چونکہ وسعت حقوق اپنے قابو کی چیز نہیں اسلئے کسی ایسے وسیلہ ترقی کا ذکر کرنا چاہیے۔ جو اہل ملک کے اختیار میں ہو۔ اور وہ قدر دانیٔ اہل فن ہے۔ غرب میں قدر دانی کی یہ نوبت ہے کہ مشہور آدمیوں کے ایک ایک لکچر کے لئے پانچ پانچ ہزار روپیہ اور دس دس ہزار روپیہ دینے کو لوگ تیار ہیں اور وہ لکچر کا ٹھیکہ لے لیتے ہیں اور ٹکٹ لگا دیتے ہیں۔ پھر سامعین اس کثرت سے جاتے ہیں کہ ٹھیکہ داروں کو بھی نفع ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی قدر دانی نام کو بھی نہیں۔ مفت لکچر سننے والے بھی پانچ دس ہزار آدمی ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتے۔ اہل ملک کو نا قدر دان ٹھہراتے ہوئے یہ بھی اعتراف کرنا ضروری ہے۔ کہ یہاں کے مقرر جو کچھ بھی ہیں۔ تقریر کی ذمہ داری کو اس حد تک محسوس نہیں کرتے جو مقرران یورپ کا خاصہ ہے۔ وہاں مشہور سے مشہور لکچرار بھی خاص تیاری کے بغیر پبلک کے روبرو نہیں آتے۔ بعض تو مہینوں پہلے تقریر کو قلمبند کرتے ہیں پھر اُس کو پچاس بار یا سو بار پڑھکر حفظ کرتے ہیں۔ اسکے بعد چند راز دار احباب کے روبرو پڑھکر اُن سے کہتے ہیں۔ کہ اگر کوئی نقص طرز ادا یا حرکات میں ہوں تو

انہیں بتادیں- یا آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر حرکات اور طرزِ ادا کی مناسبت کو دیکھتے ہیں- اور پھر سامعین کے کانوں تک اپنا پیغام پہنچاتے ہیں- نتیجہ یہ ہوتا ہے- کہ تماشائیوں کو محوِ حیرت کر دیتے ہیں- دلوں کو موم بنا لیتے ہیں- اور سامعین سے جو کچھ مانگ بیٹھیں لیکر ہٹتے ہیں- کاش ہمارے مُلک میں بھی اِس ضروری اور قابلِ قدر فن کو فن سمجھ کر اختیار کرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں- اور قومی مُفید کاموں کے واسطے ترغیب و تحریص کے لئے کارآمد ہوں- ایک برقی طاقت اُنکے ذریعہ سے اہلِ مُلک کے دِلوں پر اپنا اثر ڈالدے- اور جن جن باتوں کے لئے کام کرنے والوں کو مُستعِد کرنے کی ضرورت ہی- اسی وسیلہ سے آمادہ کئے جائیں +

حُسنِ قُدرت- حُسن ہر جگہ موجود ہی- ہاں چشمِ بینا چاہیے- بہار کے گلہائے رنگا رنگ میں اسکا جلوہ ہی- درختوں کی شاخوں اور سبزہائے نودمیدہ میں اسکی نیرنگیاں ہیں- سمندر کی تھاہ میں اور زمین کے مرکز میں یہ جاگزین ہیں اور وہاں سے آبدار موتی اور لعل و جواہر کا روپ لیکر نکلتا ہی- ان چھوٹی چھوٹی چیزوں پر کیا حصر ہی- خود بحر و بر- کوہ و راغ- ابر و باد- مہ و خورشید نورِ حُسن سے منوّر ہیں- ستاروں کو دیکھیے- سُورج کو نکلتے ہُوئے دیکھیے- ڈوبتے ہُوئے دیکھیے- ایک سے ایک دلکش نظارہ ہی- سارا جہان حُسن کا مندر ہی- اور جو اس کے وجود سے آشنا ہیں وہ ہر حال میں اور ہر آن اپنے تئیں حُسن سے محصُور سمجھتے ہیں- کسی نے کیا خوب کہا ہے- ؎ دِل اگر دانا بود در ہر سخن اسرار ہست- چشم گر بینا بود یوسف بہر بازار ہست

خاتونوں کا ورق

ملکہ معظمہ آنجہانی - وہ سانحہ جانکاہ جس نے ابھی تھوڑے دن ہوئے خاتونانِ زمانہ کی سرتاج ملکہ وکٹوریہ کی ذات کی برکتوں سے اس دنیا کو محروم کر دیا - ابھی اہلِ ہند کے دلوں میں تازہ ہے - اور اس لئے ضروری ہے کہ خاتونوں کے ورق پر سب سے پہلے کچھ مختصر سا ذکر اُس نیک نہاد اور رحم و انصاف مجسم ملکہ کا لکھا جائے جسکی ذات پر دنیا بھر کی عورتوں کو فخر کرنیکا حق ہے - تاریخِ دنیا میں کئی مثالیں ایسی عورتوں کی ملتی ہیں جنھوں نے اپنے اپنے طور پر نمایاں کام کیے ہیں - حکومتیں کی ہیں - لڑائیاں کی ہیں - بہادریاں دکھائی ہیں - مردوں سے مقابلہ میں برابر اُتری ہیں اور وہ جوہر دکھا کر - جو مردوں کا خاصہ سمجھے جاتے ہیں - دنیا کو حیران کیا ہے - اور لوگوں سے ان الفاظ میں داد لی ہے کہ کیا مردانہ عورت ہے" - مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی عورتوں کے وجود سے طبقہ نسوان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے - کیا وہ انکے کام پر ناز کر سکتی ہیں - ہمارا خیال ہے کہ نہیں کر سکتیں - انھوں نے جو کچھ کیا - شانِ نسواں کو چھوڑ کر کیا - اور کہا جا سکتا ہے کہ نسوان اصل میں تو ان کاموں کے لائق نہیں - یہ چند عورتیں مستثنیات تھیں - مگر ملکہ وکٹوریہ کے کارناموں میں یہ بڑی خوبی کی بات ہے - کہ اُس نے کام تو وہ کیے جو مردوں میں بھی کم اشخاص سے بن پڑتے - مگر خواصِ نسوان کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا - اُسکا نیک دل - اُسکا صحیح دماغ - اُسکی حرکات - اسکی سکنات - اُسکے خیالات اُسکی عادات سب ایک عورت کی عادات تھیں - تختِ سلطنت پر وہ جلال و سطوت - وہ ثقاہت اور متانت

جو مردوں میں بھی کم دیکھے سکیں۔ اور گھر میں آتے ہی اپنے شوہر سے وُہ سلوک اور اُمورِ خانہ داری کی طرف وُہ توجہ جو معمولی گھر والیاں کرتی ہیں۔ آجکل نئے خیالات کی بعض عورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ جو یہ سمجھتی ہیں کہ اگر انہیں کتاب پڑھنے یا سینے پرونے کا شوق ہوگیا۔ تو اب وُہ اولاد کی نگہداشت سے سبکدوش ہیں۔ ملکہ وکٹوریہ سلطنت کے مشاغل کو سرانجام دیتے ہُوئے اور پارلیمنٹ کے جھگڑوں جھمیلوں کی آئے دن کی گتھیاں سلجھاتے ہُوئے بچوں کی پرورش کو بھی ایسا ضروری فرض سمجھتی تھی۔ جیسے متوسّط طبقے کی مستورات جو اور تفکرات سے فارغ ہوتی ہیں۔ اور اُس نے اپنی اولاد کی اعلیٰ تربیت سے نمونہ دکھا دیا ہے۔ کہ عورت دُنیا کے بڑے سے بڑے کام کرتے ہُوئے بھی اپنا اصلی اور سب سے بڑا فرض جو تربیت اولاد سے متعلق ہے ادا کرسکتی ہے۔ اگر کوئی عورت عورت ہونے سے کنارہ کش ہوکر کاروبارِ دُنیا میں کامیاب ہو تو اُس سے عورتوں کی جماعت کو کونسی شاباش مل سکتی ہے۔ عورت کی ذات کی بہترین خصلتوں میں سے نرم دِلی ہے۔ مگر انتظامِ سلطنت اکثر نرم دلی کے منافی ہوتا ہے۔ اور بہت بہت سخت احکام انتظامی معاملات میں جاری کرنے ہوتے ہیں۔ ملکہ معظمہ نے انتظام میں بھی خلل نہیں آنے دیا۔ اور اپنے طبعی رحم کو بھی دل میں جگہ دیئے رہیں۔ مُدّت سے دستور چلا آتا تھا کہ قتل کے وارنٹ پر دستخط شاہی ثبت ہوتے تھے۔ ملکہ معظمہ کے رُوبرو جب قتل کا وارنٹ آیا۔ تو اُس نے تعمیل سے تو نہیں روکا۔ مگر خواہش ظاہر کی کہ اُسکے خاص لحاظ سے آخری دستخط کا کام کسی مُعزّز اہلکار کے سپُرد ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی عملدرآمد ہُوا۔ ایسی باتوں سے ملکہ کی ذات نے عورت کے نام کو وقعت دیدی ہے۔ اور انگلستان میں وُہ وقت آگیا ہے۔ کہ جیسے

بعض چیزوں کی تعریف کے لئے "مردانہ" کی صفت اُنکے ساتھ لگائی جاتی ہو۔ ویسے ہی بعض چیزوں کو تعریف کے طور پر "زنانہ" کہا جاتا ہو اور مثل یہاں کے زنانہ بطور صفت کے لکھنا بدصفتی میں داخل نہیں۔ ملکہ نوشابہ سکندرنامہ میں فخر سے کہتی ہو ع اگرچہ زنم زن سیر نیستم۔ ہماری ملکہ اگر اس قول کو اُلٹ کر فخریہ فرمائیں تو زیبا تھا کہ "اگرچہ کارِ مرداں کردم سیرتِ زناں از دست ندادم" +

بہرہ ہونیکی کوشش۔ خوبیٔ سماعت کے لئے گوش کر کی ضرورت ہی۔ یعنی یہ شوق چاہیئے کہ آدمی کام کی بات سُن لے اور نکمّی باتوں کے لیے بہرے سے بدتر بنا رہے۔ ماہرِ موسیقی پچاس سازوں کی متفقہ آوازمیں سے ایک ساز کی آواز کو تمیز کر سکتا ہو اور سو آدمیوں کے ملکر گانے میں کسی ایک کی آواز پہچان کر اُسی کو سُنتا رہتا ہو اور باقی سب آوازوں کے اعتبار سے بہرہ ہوتا ہی۔ تار برقی کی آواز سُننے کے مشتاق ریل کے اسٹیشنوں کی گہماگہمی اور شور وغل میں اُس ایک باریک ٹک ٹک کو سُنتے ہیں جسکے سُننے پر وہ مامور ہیں۔ اسی طرح رُوح کے گوش بھی جب ہی درست سمجھے جاتے ہیں کہ بعض آوازوں کو سُن لیں اور بعض کو کان میں پڑنے ہی نہ دیں۔ انسان کے اندر بہت سی آوازیں اسکی توجہ کو اپنی جانب کھینچنا چاہتی ہیں۔ دُنیا اپنی طرف بلاتی ہی۔ نفسانیت اپنی جانب کھینچتی ہی۔ اور شیطان اپنی طرف گھسیٹتا ہی۔ لیکن مشتاق رُوح ان سب کے شور میں صرف خدا کی لطیف آواز سُنتی ہی۔ اور اس بات کی عادی ہوتی ہو کہ باقی سب آوازوں کے لئے بہری بنی رہے۔ جب کبھی ہم خدائے سمیع و بصیر سے گوش شنوا مانگیں ہمیں یہ بھی دُعا کرنی چاہیئے کہ اُسکے ساتھ وہ ایک حد خاص تک گوش کر بھی ہمیں عنایت فرماوے۔ تاکہ اس گوش کر کی بدولت ہم اُن آوازوں کو جو سُننے کے قابل ہیں۔ زیادہ عمدگی اور صفائی سے سُنیں +

کوہستانِ ہمالہ

شیخ محمد اقبال صاحب - اقبال ایم - اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور - جو علوم مغربی و مشرقی دونو میں صاحب کمال ہیں - انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چُومتا ہی تیری پیشانی کو جُھک کر آسماں
تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں دیرینہ روزی کے نشاں — تو جواں ہی دورہ شام و سحر کے درمیاں

تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیّر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہی تُو — پاسباں اپنا ہی تُو دیوارِ ہندوستاں ہی تُو
سُوئے خلوتگاہِ دل دامن کشِ انساں ہی تُو — مطلعِ اوّل فلک جسکا ہو وہ دیواں ہی تُو

برف نے باندھی ہی دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہی جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

سلسلہ تیرا ہی یا بحرِ بلندی موجزن — رقص کرتی ہی مزے سے جسپہ سُورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہی وطن — چشمۂ دامن میں رہتی ہی مگر پرتو فگن

چشمۂ دامن ہی یا آئینہ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جسکے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کیواسطے — تازیانہ دیدیا برقِ سرِ کوہسار نے

اے ہمالہ کوئی بازیگاہ ہے تو بھی جسے　　دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا جوش مسرت میں چلا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر

جُنبش موج نسیم صُبح گہوارہ بنی　　جھُومتی ہے کیا مزے لے لیکے ہر گُل کی کلی
یُوں زبانِ برگ سے کہتی ہے اسکی خامشی　　دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنج خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہُوئی　　آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہُوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہُوئی　　ناز کرتی ہے فراز راہ سے جاتی ہُوئی

چھیڑتا جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مُسافر دل سمجھتا ہے تیری آواز کو

لیلے شب کھولتی ہے آکے جب زُلفِ رسا　　دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وُہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا　　وُہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہُوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ تیرے رُخسار پر

وُہ اُچھالی پنجۂ قدرت نے گیند اِک نُور کی　　جھانکتا ہے وُہ درختوں کے پرے خورشید بھی
دِل لگی کرتی ہے ہر پتّی سے جسکی روشنی　　میرے کانوں میں صدا آئی مگر کچھ اور ہی

دِل کی تاریکی میں وُہ خورشید جاں افروز ہے
شمع ہستی جسکی کرنوں سے ضیا اندوز ہے

وہ اصولِ حق نمائے نفیِ ہستی کی صدا[1] — رُوح کو ملتی ہے جس سے لذتِ آبِ بقا
جس سے پردہ رُوئے قانونِ محبت کا اُٹھا — جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا

تیرے امن کی ہواؤں سے اُگا تھا یہ شجر
بیج جسکی ہند میں ہے چین و جاپاں میں ثمر

تُو تو ہے مُدت سے اپنی سرزمیں کا آشنا — کچھ بتا ان رازدانانِ حقیقت کا پتا
تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا — تیرے ہر ذرہ میں ہے کوہِ المپس[2] کی فضا

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراسر چشمِ بینا کے لئے

اے ہمالہ داستاں اُسوقت کی کوئی سُنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جسپر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

آنکھ اے دل کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ — اس فضا کو اس گلِ گلزار کی رنگت کو دیکھ
اپنی پستی دیکھ اور اس کوہ کی رفعت کو دیکھ — اس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاہدِ مطلب ملے جس سے وہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے وہ درماں ہے یہی

[1] بدھ مذہب کے اعتقاد کی طرف اشارہ ہے +

[2] کوہِ المپس - یونان میں ایک مشہور پہاڑ ہے - جس پر قدیم یونانی خیالات کے مطابق دیوتاؤں کے دربار ہوتے تھے +

ندی کا راگ

زبان انگریزی میں لارڈ ٹنی سن کی ایک مقبول نظم "دی بروک" کے نام سے مشہور ہے۔ اسکا بامحاورہ اور آزادانہ ترجمہ ہمارے مہربان منشی ظفر علیخاں صاحب بی۔ اے۔ حیدرآباد دکن سے بھیجتے ہیں۔ آپ کا مولد و منشا پنجاب ہے۔ اور آپ علیگڈھ کالج کے منتخب اور ہونہار تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے ہیں۔

بگلوں اور چہوں کے نشیمن سے میں نکلکر ناگاہاں — چشم زدن میں سیل بلا کی طرح جھپٹ کر آتی ہوں

سبزہ کے فرش استبرق پر مثل دراری غلطاں — کروٹیں لیتی ہوئی وادی میں پہنچکر شور مچاتی ہوں

کتنی گھاٹیوں کے دامن کو راہ میں آتی جھٹک کر میں — کتنے ٹیکروں اور ٹیلوں کے تلوے میں سہلاتی ہوں

بیسیوں گاؤں اور قصبوں کے پہلو سے نکلی شتاب کر میں — سیکڑوں پل ہیں مٹھی میں دل جنکا میں جھ اکراتی ہوں

زید کے کھیت کے نیچے بہ کر تھوڑی سی دُور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھارے
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

تان کھرج کی یا پنچم کی چھیڑتی ہوں بیخود ہو کر — ریزۂ سنگ سے تار آب پہ دلکش زخمہ لگاتی ہوں

پاؤں پہ جھانجھ بھنور کی پہنے اوڑھے لطافت کی چادر — چھم چھم کرتی ہوئی آپ اپنے حسن پہ میں اتراتی ہوں

بنکر میں مشاطہ کبھی اُلجھاتی ہوں گیسوئے ساحل کو — کھیتوں کا دھو آتی ہوں مُنہہ میدانوں کو نہلاتی ہوں

اور کبھی ساقی بنکے مرتب کرتی ہوں سبزہ کی محفل کو — ساغر نامیہ بھر کے بنفشہ اور سمن کو پلاتی ہوں

گاتی بجاتی جشن مناتی تھوڑی سی دُور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھارے

مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

زیب بدن میں کرکے آب رواں کا پاک اور صاف لباس
ساحت ہاموں پر جسدم بل کھاتی ہوئی اٹھلاتی ہوں
اپنے آنچل میں بھرلاتی ہوں میں کہیں پھول اور کہیں گھاس
گودیوں میں رہرو کو کبھی جھینگے کو کبھی میں کھلاتی ہوں
کف کے عنبریں رنگ کے گالے مجھ پہ کہیں ہیں تیر رہے
مارتی ہوں میں حباب کو گاہے اور کبھی اسکو جلاتی ہوں
لوٹتے لوٹتے رستہ میں بستر پہ سنہری کنکروں کے
میں ٹکرا کے کسی پتھر سے روپہلی چھینٹیں اڑاتی ہوں

بہتی بہتی بس اس انداز سے تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمر و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدا
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

اڑتی ابابیلوں کے ساتھ اڑاتی اپنی زیر و بم
میں کبھی پہیلی اور کبھی پٹی اور کبھی آنکھ اڑاتی ہوں
سورج کی کرنوں کو اپنے ریت کے ٹاپوؤں پر پیہم
رقص میں لا کر زہرہ کو افلاک پہ میں شرماتی ہوں
دشت نوردی بادیہ گردی کرتی اک انداز سے میں
سبزۂ تر کو چھیڑتی ہوں اور بیدوں میں لہراتی ہوں
لالہ و سنبل کو جو مظاہر عاشق اور معشوق کے ہیں
میٹھی نیند سے گدگدی لیکر چلتے چلتے جگاتی ہوں
جھاڑوں میں جھنکاروں میں صحراؤں میں ویرانوں میں سدا
چاند کو اور تاروں کو میں اپنا میٹھا راگ سناتی ہوں
اپنے ریت کے مینڈوں میں کچھ دیر کو لیتی ہوں سستا
اپنے کنارہ کی بوٹیوں سے دم بھر کو میں دل بہلاتی ہوں

کاٹتی ہوں اک چکر پھر اور تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمر و زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدا
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

نیرنگِ شفق

یہ غزل جناب سید غلام بھیک صاحب نیرنگ۔ بی۔ اے کی طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ نیچرل رنگ جس خوبی سے غزل پر چڑھایا گیا ہے۔ واقعی تحسین کے قابل ہے۔

کھلا ہے گلشنِ مغرب میں لالہ زارِ شفق
زبس ہے رَوکشِ صحنِ چمن بہارِ شفق

ہوا ہے واردِ مغرب جو خسروِ خاور
بنا ہے اُسکے لئے قصرِ زرنگارِ شفق

وفورِ نشہ سے چہرے پہ چھاگئی سُرخی
پئے ہے مَے قدحِ خور میں بادہ خوارِ شفق

نگاہ شوق کی گرمی سے جھینپ جاتی ہے
حیا کے جوش سے ہے سُرخیِ عذارِ شفق

شمار لالہ رخوں میں ہوا ہے پارۂ ابر
چُرا لیا ہے جو کچھ غازۂ عذارِ شفق

دیا ہے ابر کو اک دُھوپ چھاؤں کا خلعت
لگا جو بانٹنے انعام تاجدارِ شفق

اِسی کے شوق میں دن بھر سفر میں تھا خورشید
ہوا ہے کیا ہی محبت سے ہمکنارِ شفق

ستارے دیکھ شفق میں گماں گذرتا ہے
کھلا میانِ سمن زار لالہ زارِ شفق

شفق کے گِرد ستاروں کا یہ ہجوم نہیں
دُرِ یتیم کرے ہے فلک نثارِ شفق

خُمِ فلک کو مَے لالہ گوں سے پُر کرکے
قدح کشی میں ہے مصروف بادہ خوارِ شفق

برنگِ شاخِ ثمرور سدا ہے سر بزمیں
ہے ایسے حُسن پہ اس درجہ انکسارِ شفق

ادب سے سر بزمیں ہوکے دلکو موہتی ہے
غرورِ حُسن سے بڑھ کر ہے انکسارِ شفق

یقیں دلاتی ہے اک ماہرو کے ملنے کا
بہارِ گلشنِ اُمید ہے بہارِ شفق

جواب چرخ کو سُوجھا ہے قصرِ حمرا کا
زمیں کے گِرد کھچا ہے جو یہ حصارِ شفق

سمیں شفق کے وُہ چھائے ہیں میری نظروں میں
کہ میرا تارِ نظر تک بنا ہے تارِ شفق

لکھی یہ تُو نے وُہ رنگیں غزل کہ اے نیرنگ
ہر ایک شعر ہے گلگونۂ عذارِ شفق

دل و دماغ

عظیم آباد (پٹنہ) کے نامور شاعر حافظ سید فضل حق صاحب آزاد نے ہمیں ایک نظم ارسال فرمائی ہے۔ جو انہوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے گذشتہ سالانہ جلسہ کے لئے لکھی تھی۔ مگر چونکہ وہ تشریف نہیں لا سکے۔ اس لئے وہاں نہ پڑھی جا سکی۔ وہ مکمل صورت میں تو رسالہ انجمن میں چھپے گی۔ اور قدردانانِ سخن سے خود بخود داد لیگی۔ ہم سردست اس کے ابتدائی دو بند جو عام دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور دل اور دماغ کے باہمی تعلقات کے بیان میں لاجواب ہیں۔ اقتباس کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ناظرین مخزن کو حضرت آزاد کے کلام سے مستفیض ہونیکا اکثر موقعہ ملیگا۔

واقعاتِ دہر کے دنیا میں ہیں جو سبز باغ — نخلبند انکا اگر دیکھو تو دل ہے یا دماغ
حکمرانی دونوں عالم میں انہیں دونوں کی ہے — انکے الجھیڑوں سے انسانکو نہیں دم بھر فراغ
ق
بت پرستی حق پرستی امن و عذر خیر و شر — ظلم و حلم و صلح و جنگ و عدل و داد و درد و داغ
سعی و تدبیر و توکل جبر و دفع و رتق و فتق — خط کے ہر نقطے سے ان دونو کا چلتا ہے سراغ
عقل نے روشن دماغی کی دکھائی روشنی — نورِ ایمان نے جلایا کعبۂ دل میں چراغ
جب تلک ان دونو کا دنیا میں ہے دورِ معتدل — زندگانی باغِ جنت ہے چھلکتے ہیں ایاغ
اک ذرا ان میں کسی صورت جہاں اَن بن ہوئی — وہ بہارِ زندگانی ہے نہ روح افزا وہ باغ
دل سے منہ پھیرا دماغ عقل پیرو نے جہاں — دن سے رات اچھی وہاں کی باغ سے بہتر ہے راغ
دل نے بھی روشن دماغی کی اگر پروا نہ کی — روشنی پھر ہے تو تاریکی جو بلبل ہے تو زاغ

تم سے ہیں ساز و نوائے زندگی ناہم سے ہیں
گلشنِ ہستی کے چہکارے انہیں کے دم سے ہیں

دل سے کیا مطلب ہے وہ مطلب تو کر لو دلنشیں ۔۔۔ دل جو اک مُضغہ ہے پہلو میں یہ دل وہ دل نہیں
دل وہ دل آرایشِ ایمن ہے جسکے درد و داغ ۔۔۔ گرد دامن بھی نہیں ہے رشک و عناد و بغض و کیں
یاس میں بھی اسکو اُمیدیں غموں میں خرمی ۔۔۔ مست و مسرور اسکو کہہ سکتے نہ مغموم و حزیں
درد دارو۔ نفع نقصاں ہے حیات اسکو ممات ۔۔۔ زہریاں سب سختیاں ہیں تلخیاں ہیں انگبیں
کھینچ دے اسکو شکنجے میں اگر دورِ زماں ۔۔۔ لب پہ اُف ابرو میں بل آئے نہ پیشانی پہ چیں
سارے عالم سے جدا اسکی سمجھ اسکا خیال ۔۔۔ ساری دُنیا سے انوکھی اسکی دُنیا اور دیں
کچھ نہیں چلتی دماغ عقل پرور کی یہاں ۔۔۔ تھک کے رہجاتی ہے اس منزل میں عقلِ دوربیں
اس مقدس دل کو جو چاہیں کہیں روشن دماغ ۔۔۔ تکملے اخلاق کے ممکن ہیں بے اِسکے کہیں؟
عرش کو پہنچے ہوئے گرجائینگے عالی دماغ ۔۔۔ تمکو مل جائے جو کوئی اہلِ دل صحرانشیں

جس طرح عالی دماغوں کی ضرورت ہم میں ہے
اہلِ دل کی بھی سدا سے ڈھونڈھ اس عالم میں ہے

حسنِ طلب

چودہری خوشی محمد صاحب ناظر بی۔اے کے نام نامی سے اردو خواں پبلک خوب واقف ہے۔ آپ علیگڈھ کے ممتاز گریجوایٹ اور مولنا حالی مدظلہ کے شاگرد رشید ہیں۔ انہوں نے رامپور کانفرنس میں حضور پُرنور سے اِستمداد کالج کے لئے ایک نظم لکھی تھی جو آج تک شائع نہیں ہوئی اسکا ایک بند اُس موقعہ سے زیادہ مخصوص تھا۔ اُسے چھوڑ کر ہم دوسرا بند یہاں درج کرتے ہیں۔ جو "حُسنِ طلب" کا ایک اچھا نمونہ ہے +

گلشن میں گو نہیں وہ فصلِ بہار باقی ۔۔۔ اب تک ہے یادِ گل میں صوتِ ہزار باقی

آنکھوں میں بزم جم کا نقشہ سما رہا ہے　ہو جام جم کا اب تک سر میں خمار باقی
خالی ہیں قصر و منزل بغداد و اندلس کے　ہیں بام و در پہ لیکن نقش و نگار باقی
گذرا تھا جس زمیں سے خیل و حشم ہمارا　اس رہگذار میں ہیں کچھ شہسوار باقی
ہیں قافلوں کے مامن اور رہروؤں کے ماوا　صحرائے لق و دق میں کچھ سبزہ زار باقی
اللہ رکھے ہمیشہ تاج و لوا کو اُن کے　ہیں قوم بینوا میں جو تاجدار باقی
گلزار آصفی میں ہو فصل گل ہمیشہ　خُلد آشیاں کی دائم ہو یادگار باقی
برطانیہ کی ان سے افزوں ہو شان و شوکت　ہو باغ قیصری میں ان سے بہار باقی
سرکار میں ہے انکی داد و دہش سلف کی　دربار میں ہے انکے قومی شعار باقی
دل قوم کے رہینگے اُلفت سے انکی روشن　سینہ میں سنگ کے ہو جبتک شرار باقی
شہر و دیار انکے - باغ و بہار ان کے　رحمت سے اپنی رکھیو یا کردگار باقی
یہ بارگاہ و ایواں یہ قصر و کاخ و دیواں　یہ بزم خاص اعیاں ہو برقرار باقی
لیگا خبر کسی دن اس کشت آرزو کی　ابر بہار پہ ہے اپنا اُدھار باقی
اس آستاں تک اپنی ہو یا نہ ہو رسائی　ہو بزم یار دائم اور حُسن یار باقی

اے آب دجلہ تیری دائم رہے روانی
سرسبز کھیت ہونگے پیاسے پئینگے پانی

مُنتخباتِ میرؔ

اُستادانِ سخن کے انتخاب کے سلسلہ میں ہم تبرکاً سب سے پہلے شہنشاہِ اقلیمِ سخن جناب میر تقی صاحب میرؔ مرحوم کے کلام کو لیتے ہیں۔ انکے بعد کوئی مشہور شاعر اردو زبان میں ایسا نہیں ہُوا۔ جو اِنکی اُستادی کا مُقر نہ ہوا ہو۔ کہا جاسکتا ہی کہ جس غزل میں غالبؔ اور ذوقؔ نے دلی میں اور آتشؔ اور ناسخؔ نے لکھنؤ میں نام پیدا کیا۔ اور جسکی زمین کو اِنہوں داغؔ دہلوی اور امیرؔ لکھنوی کی رنگین نوائیوں نے آسمان بنا دیا۔ اس کی بنا ڈالنے والوں میں میرؔ مرحوم ہی تھے۔ ذوقؔ کا شعر تو آنکی تعریف میں معروف ہی ہی۔ مگر غالبؔ نے ایک عجیب انداز سے دادِ سخن دی ہی۔ ناسخؔ کے ایک قول کو اپنی غزل کے ایک مقطع میں بڑی خوبصورتی سے اپنا بنا لیا ہی۔ وُہ کہتے ہیں ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہی بقولِ ناسخؔ — آپ بے بہرہ ہی جو معتقدِ میرؔ نہیں

اُس قادر الکلام شاعر کے دیوان جس قدر اساتذہ میں مقبول رہے ہیں۔ اُسی قدر فی زمانا متروک ہیں۔ سبب یہ ہی کہ ان میں زبان کسی قدر پُرانی ہی۔ غزل کی اُردو میں ابتدائی حالت ہی۔ اور پُرانے لوگوں کے خیالات نسبتاً سادگی لئے ہُوئے ہوتے ہیں۔ اِسلئے آجکل کے لوگ متوجہ کم ہوتے ہیں۔ اِس پر طرُہ یہ ہی کہ اُنکا کلام سات جلدوں میں ہی۔ کاروبارِ دُنیا اور نئی تعلیم کے مشاغل کسے اتنی فرصت دیتے ہیں کہ وہ ان پُرانے دیوانوں کی ورق گردانی کرے۔ مگر اس غفلت میں زبانِ اُردو کے ایک مُسلّم اُستاد کے کلام کا بہترین حصہ بھُولتا جاتا ہی۔ اِس لئے ہم ردیف وار ہر غزل کے انتخابی شعر دینے شروع کرتے ہیں۔ تاکہ جب یہ سلسلہ مکمل ہوجائے تو منتخباتِ میرؔ علیحدہ چھپ سکیں اور اگر ابنائے وطن میں سے کوئی اور صاحب ایسا انتخاب تیار کرنے کی فکر میں ہوں تو اُنکو کچھ مدد مل سکے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ انتخاب خاتم ہی۔ ممکن ہی کئی کام کے شعر رہ جائیں۔ یا جو اشعار بعض نظروں میں بہت بلند پایہ نہیں۔ وُہ اِس میں آجائیں۔ لیکن جہانتک ہوسکا ہی۔ بہت غور سے انتخاب کیا گیا ہی۔

تھا مُستعار حُسن سے اُسکے جو نُور تھا — خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

ق

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وُہ استخوان شکستوں سے چُور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
مَیں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرُور تھا

تھا وُہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصُور تھا

نکلے چشمہ جو کوئی جوشِ زناں پانی کا
یاد دہ ہے وُہ کسو چشم کی گریانی کا

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنے رات بہت تھے جاگے صبح ہُوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہُوئی
کوسوں اسکے دُور گئے پہ سجدہ ہر ہر گام کیا

یانکے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہی تو اتنا ہی
رات کو رو رو صبح کیا یا دنکو جوں توں شام کیا

کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے
استغنا کی چوگنی اُن نے جوں جوں میں ابرام کیا

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہیگا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یہاں ہر سفری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کے اس کارگہِ شیشہ گری کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تاب کس کو جو حالِ میر سُنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

لیتے ہی نام اُسکا سوتے سے چونک اُٹھے
ہے خیر میرؔ صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا
گرمی اُس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب
جب کوئی میری طرح سے دیوے سب تن من جلا
ہو جو منت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی
کاٹ اپنی رات کو خار و خس گلخن جلا

خوابِ غفلت میں ہیں یاں سب تو عبث جاگا میرؔ
بے خبر دیکھا اُنہیں ہیں جنہیں آگاہ سُنا

ہم سرکشی سے مدتوں مسجد سے بچ بچکر چلے
اب سجدے ہی میں گذری ہے قد جو ہُوا محراب سا

رکھ ہاتھ دل پہ میرؔ کے دریافت کر کیا حال ہے
رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا

پوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں یہ صنم تو
اب کس طرح اطاعت انکی کروں خدایا

کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو
احوال کیا کہوں میں اس مجلس رواں کا
یا روئے یا رلایا اپنی تو یونہی گذری
کیا ذکر ہم صفیر و یارانِ شادماں کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن
شوق نے ہم کو بے حواس کیا

دیگی نہ چین لذتِ زخم اس شکار کو
جو کھا کے تیرے ہاتھ سے تلوار جائیگا
آنے میں اُسکے حال ہوا جائے ہے تغیر
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائیگا

جو سنا ہشیار اس میخانے میں تھا بے خبر
شوق ہی باقی رہا ہمکو دلِ آگاہ کا

ناکامی صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
اب جی سے گذر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

کسکو نہیں ہے شوق ترا پر نہ اس قدر
میں تو اسی خیال میں بیمار ہوگیا

گرمیٔ عشق مانع نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اُس کے رُوبرو نہ گیا

جن بلاؤں کو میر سُنتے تھے
ان کو اس روزگار میں دیکھا

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

ہم نے جانا تھا لکھیگا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو ایک شوق کا دفتر نکلا

یاد اس کی اتنی خُوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میر کسکو اب دماغِ گفتگو
عُمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

کچکول

اس حصہ میں مختلف اُستادوں کے مختلف قسم کے کلام کے ایسے ٹکڑے لئے جائینگے - جو بلحاظ مطالب وبلند خیالی یاد رکھنے کے قابل ہوں - یا بلحاظ ترکیب و بندشِ الفاظ کچھ خصوصیت رکھتے ہوں - ہر صنفِ سخن کے اُستاد سے اس کچکول گدائی کے لئے کچھ مانگ کر - اسکو بعینہ کچکول بنایا جائیگا - کہتے ہیں گداگری میں ایک اس قسم کی چاشنی ہے کہ جب گدائی زبان رنگا رنگ کے لقموں کے مزے چکھ لیتی ہے تو اسے ایک طشت خواہ کیسے ہی تکلف کھانے کا دیدہ و مزا نہیں دیتا - اسی طرح علم ادب کی دلچسپیوں کے متلاشی نہ ایک صنفِ سخن پر قانع رہتے ہیں اور نہ ایک دروازہ کو کھٹکھٹا کر صبر کرتے ہیں - حالی نے کیا خوب کہا ہے -

ٔ لیجئے بھیک دوڑ کر ہو گداگری کا یہ - جس سے ملے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے

شبِ غم

رنج و غم کی رُو سے چرخِ پیر پر — چار سُو چھائی ہوئی تھیں بدلیاں
عالمِ ہو ہر طرف آیا نظر — گھڑی کیا سنسان تھا سارا جہاں
شب تھی یا قہرِ خداوندِ قدیر — رات تھی وہ یا بلائے ناگہاں
میں تھا اور میرا دلِ ناشاد تھا — اور درد و غم تھے اس میں میہماں
خرمنِ ہستی میں لگ جاتی تھی آگ — جب چمکتی تھیں فلک پر بجلیاں
میرا غمخانہ جلانے کے لئے — آگ برسانے لگا تھا آسماں
دیکھکر عالم شبِ تاریک کا — رُک گئی تھی خوف سے عمرِ رواں
تھا اندھیرا گھُپ کچھ ایسا دہر میں — رہ گئیں آنکھوں میں چھپ کر پتلیاں
چلتے چلتے تھم گئی بادِ صبا — بہتے بہتے رُک گئی تھیں ندیاں
رُک گئے تھے دور سے لیل و نہار — تھم گئے تھے چلتے چلتے آسماں

(فیروز شاہ خانصاحب فیروز رامپوری)

ذوقِ سخن

بندہ نہیں اُن میں جو مریں گلبدنوں پر — یا ہوں متوجہ کبھی غنچہ دہنوں پر
یا میل کریں عطرفشاں پیرہنوں پر — ہاں طبع جو مائل ہے تو رنگیں سخنوں پر
شاہد ہے خدا یار موافق ہوں تو ان کا
شیدا ہوں تو انکا ہوں جو عاشق ہوں تو انکا

(مونس)

(میر انیس مرحوم کے بھائی کے ایک مشہور مرثیہ میں یہ بند ہے)

حسرت و حیرت

تو بھی گر لب سے خموشی میں نہ نکلے گا ہی
مجھ پہ آئے آہ نہ اطلاق ہو گویائی کا

حسرتِ مردہ کو دم بھر میں جلا لیتا ہوں
آپ کیا مجھ کو بھی دعوی ہے مسیحائی کا

میں بھی خود آپ میں پھروں نہیں آتا ظالم
پوچھنا کیا ہے میرے گوشۂ تنہائی کا

کیوں نہ سالک مری حیرت پہ جہاں ہو حیراں
محوِ حیرت ہوں میں کس محوِ خود آرائی کا

(سالک دہلوی)

ہجوِ بُتاں

بے مروت ہیں یہ بُت جھوٹ ہی کہنا انکا
دے قیامت کی خبر وعدۂ فردا انکا

شکل سے رحم عیاں دل میں نہاں کیا کیا گُن
نہ بچا ہے نہ بچے گا کوئی مارا انکا

آدمی آپ تماشائے جہاں بنتا ہی
بھول کر دیکھنے جائے جو تماشا انکا

جسکو کہتے ہیں قضا ہی نگہ ناز ان کی
ملک الموت ہی وابستۂ ایما ان کا

یہاں جلے رشک سے وہاں آتشِ دوزخ میں پھنکے
کہیں آرام سے رہتا نہیں شیدا انکا

ایک عالم ہے حزیں پوچھے جس سے احوال
آہ بھر کر کہے مظلوم ہوں ان کا انکا

(سالک دہلوی)

سُرعتِ اسپ

(نظم میں جو جائز صفت مبالغہ کی ہی۔ اسکا معراج میر انیس مرحوم کے اس بند میں
جو گھوڑے کی تیز رفتاری کی تعریف میں ہی ملاحظہ ہو)

تصویر کھینچے اُسکی مصور تو پڑے دھوم
سرعت قدم توسنِ تصویر کو لے چوم

کوڑا پئے تعزیر جو چاہے کرے مرقوم
اک آن میں تصویر کا سب رنگ ہو معدوم

نقاش کا دل نقش پہ آمادہ ہی رہ جائے
اور ہاتھ میں اسکے ورق سادہ ہی رہ جائے

(انیس)

بے ثباتی عیش

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار تم کو گر ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

(غالب)

خوفِ تیغ

بیٹھ کر خاک پہ غلطاں ہوئے وہ دونو یتیم
لپٹا یوں بھائی سے بھائی کہ ہلا عرشِ عظیم

تیغ چمکانے لگا بچوں کے سر پر وہ لئیم
اُٹھ کے تعظیم سے کی دونو نے جھک کر تسلیم

خوف سے بند تھے منہ بات نہ کیجاتی تھی
اُستخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی تھی

(دبیر)

دل کو مرے شغل غمگساری کا ہے
غفلت میں بھی طور ہوشیاری کا ہے

گردوں کو اگر ہے سرکشی کا غرّہ
ہم کو بھی غرور خاکساری کا ہے

(دبیر)

اشتہارات

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوگا

قیمت عمدہ دبیز ولایتی کاغذ پر بلا محصول .. ملے

دوم درجہ دیسی کاغذ پر " ... ع

محصولڈاک دو نو صورتوں میں " .. ۶ر

(مقامی خریداروں کو محصولڈاک معاف)

اشتہار شائع ہوتے ہی پیشگی قیمتیں اور ویلیو پے ایبل بھیجنے کی اجازتیں توقع سے بہت زیادہ آئی ہیں۔ جنکے لیئے قدر دانان کا شکریہ ہے۔ اب نمونہ دیکھکر مزید قدردانی ہونی چاہئے۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے ۴ر کے ٹکٹ ارسال فرمایئے۔

شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر

زیرِ طبع

قاری محمد سرفراز حسین۔ عزمی۔ دہلوی کی جدید تصنیفات

(انگریزی میں)

(۱) محاسنِ اسلام۔ اس میں حسب ذیل چھ مضمون شامل ہیں جو ملک امریکا میں شائع ہو چکے ہیں، اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں

۱۔ روحانی تعلیم
۲۔ توحید
۳۔ رسالت
۴۔ ارکانِ دین
۵۔ از مہد تا لحد
۶۔ موت و مابعد

قیمت ۸ر محصولڈاک وغیرہ ار

(۲) مطالب قرآن حصہ اول ۔ پارہ الٓمٓ
قیمت ۴ر محصولڈاک وغیرہ ار

اردو میں

قطرات اشک۔ اسمیں چھ قومی اور مذہبی مضامین شامل ہیں

قیمت ۴ر محصولڈاک وغیرہ ار

المشتہر رحمت خاں اینڈ سنز۔ نینی تال

پنجاب آبزرور

شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کو حکام کی زبان میں حکام وقت تک پہنچانیکا واحد ذریعہ

ہفتہ میں دو بار

لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ پنجاب کے بہت سے اعلیٰ یوروپین افسر اسکے خریداروں میں ہیں۔ اور جو باتیں اس اخبار میں درج ہوں یقیناً حکام کی نظر سے گذرتی ہیں۔

قیمت سالانہ پیشگی ... ... عـــہ

غلام رسول بی۔ اے مینیجر

کایستھ سماچار

یہ ماہوار میگزین انگریزی میں الہ آباد سے بزیر ایڈیٹری مسٹر ایس۔ سنہا بیرسٹر ایٹ لا بڑی آب و تاب اور قابلیت سے شائع ہوتا ہے ملک بھر کے اخبارات نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ اس میں بیشتر حصہ ایسے مضامین کا ہوتا ہے جو عام پسند ہوں۔ اور ہر قوم کے لائق مضمون نگار اپنے انگریزی مضمونوں سے اس رسالہ کو رونق دیتے ہیں۔ اسپر خوبی یہ کہ قیمت نہایت ارزاں ہے۔ مگر پیشگی کی سخت پابندی ہے۔

مینیجر کایستھ سماچار۔ الہ آباد

زبانِ خلق

اخبار ٹریبیون لاہور - مورخہ ۹ - اپریل ۱۹۰۱ء - پنجاب بزرور لاہور کی طبّاع ایڈیٹر شیخ عبد القادر کا نام اُس رسالہ کی عمدگی کی کافی کفالت ہی جو وُہ نئی انداز پر اُردو میں نکالنا چاہتے ہیں - مضمون نگار بیشتر یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ اور ہندو مسلمان دونوں اقوام میں سے ہونگے - کوشش کیجائیگی کہ یہ رسالہ اُردو علم ادب کیلئے وُہ کام کرے جو بنگا درشنا اور آریہ درشنا نے بنگالی لٹریچر کیلئے کیا تھا - ..... ہم اُمید کرتے ہیں کہ سب صاحبان جو ملکی لٹریچر کی ترقّی کے دل سے خواہاں ہیں - اس رسالہ کی قدردانی کرینگے - اور اسے پُوری مدد دینگے +

اخبار سول اینڈ ملٹری نیوز لودیانہ - ہم اس رسالہ کے لئے ہر ایک کامیابی کے خواستگار ہیں اور اُردو علم ادب کا صحیح مذاق رکھنے والوں سے اسکی سرپرستی کی سفارش کرتے ہیں +

اخبار چودھویں صدی راولپنڈی - شیخ صاحب کی اُردو انشا پردازی اور قابلیت ملک میں مسلّم ہوچکی ہے - لہٰذا اُمّید ہے کہ ابنائے مُلک اس قابلِ قدر رسالہ کی قدردانی کرینگے +

پیسہ اخبار لاہور :- اُردو زبان کے ماہوار رسالوں میں سب سے آخری اضافہ جو شیخ عبد القادر صاحب بی - اے ایڈیٹر پنجاب بزرور کے رسالہ "مخزن" سے ہوا ہے ہم یقین ہے اُردو لٹریچر کے قدردان اُسے ضرور قابلِ قدر پائیں گے

اخبار وطن - لاہور - ابنائے وطن کے لئے بیشک یہ نہایت خوشی کا موجب ہے کہ ایسے قابل اور ہونہار فرزندانِ مُلک قومی و ملکی خدمت کے ساتھ ہی اپنی زبان کی خدمت و ترقّی کی طرف بھی متوجہ ہوگئی ہیں اور ہمیں کامل یقین ہے کہ مُلک اس رسالہ کی پُوری پُوری قدردانی کریگا +

اخبار اتفاق - سادھورہ - اِس امر کے یقین کرنے میں کچھ بھی تامّل نہیں ہوسکتا کہ مخزن ایک لاجواب اور بے نظیر علمی رسالہ ہوگا +

اخبار الپنچ - بانکی پور - اُنکی (ایڈیٹر کی) مستقل مزاجی اور منچلاپن سے توقّع ہوتی ہے کہ وُہ اپنی بات کے دھنی ہونگے اور اُردو علم ادب میں ایک نئی رُوح پھونک کر رہینگے +

٨١٦٩